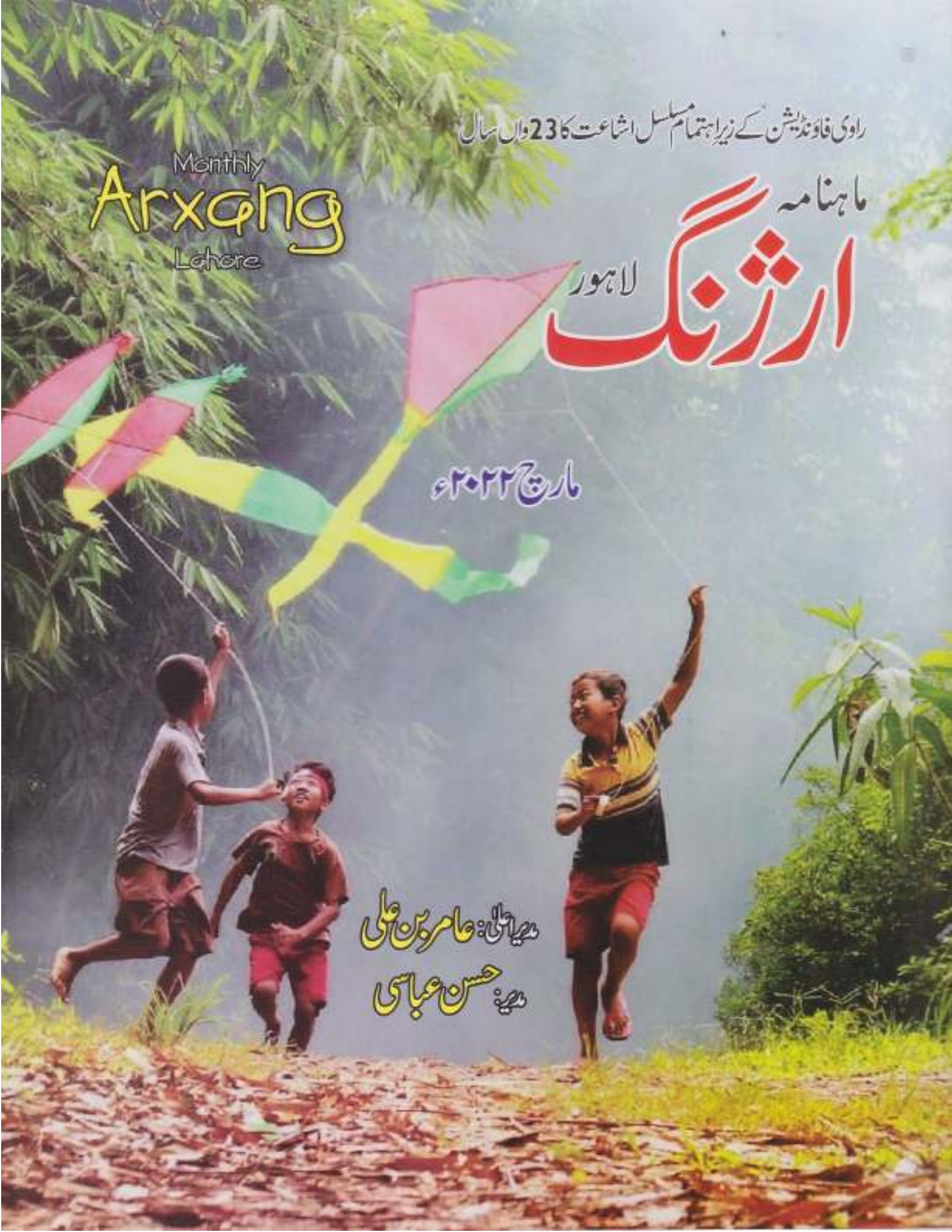

راوی فاؤنڈیشن کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کا 23واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مارچ ۲۰۲۲ء

مدیراعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

اچھی تخلیق وہی ہے جسے حقیقت سے کشید کیا گیا ہے

لوگوں نے بڑی ''رغبت'' سے کتاب بینی ترک کی ہے

مسقط (عمان) میں مقیم نوجوان شاعر، ادیب، کالم نگار اور ماہر تعلیم

فہیم ضیاء

سے

مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،

کالم نگار اور سفر نامہ نگار **عامر بن علی** کا مکالمہ

رجحان ساز شاعروں کا مطالعہ نئے لکھنے والوں کو اعتماد اور نئی منزلوں کی بشارت دیتا ہے

سوال۔ سب سے پہلے اپنے سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے۔

جواب: میرے آباواجداد نے اقیام پاکستان کے وقت د ہندوستان (سونی پت) سے ہجرت کر کے پاکستان (خانیوال) آئے کر۔ میری پیدائش خانیوال میں ہوئی۔ خانیوال کے گلی کوچوں میں کھیلتے کودتے جوان ہوگئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں میں ہی حاصل کی بہاء الدین زکریہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو پاس کیا۔

سوال نمبر۔ عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا۔

جواب۔ عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کیا، سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں تعلیمی خدمات انجام دیں آجکل بیرون ملک مقیم ہوں اور پاکستان سکول عمان (مسقط) میں بطور اردو معلم اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

سوال۔ ادب سے شوق کی ابتدا؟

جواب۔ کالج کے زمانے میں غیر نصابی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا آہستہ آہستہ نثر لکھنے لگا اور شعر کہنے لگا۔

سوال۔ اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے

جواب: میری دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک سنجیدہ غزلوں پر مشتمل ہے جس کا نام ''قسم لے لو محبت ہے'' اور دوسری مزاحیہ شاعری پر مشتمل ہے جس کا نام ہے'' بچہ جمورا''۔ ''قابوس کی جنت'' (سفر نامہ عمان) اور نعتیہ مجموعہ، اخباری کالموں کا مجموعہ تصنیف کے مراحل سے گزر چکا ہیں۔ لیکن، ذاتی مصروفیت کی وجہ سے ان کتابوں کی اشاعت ممکن نہیں ہو رہی۔ امید ہے اس برس یہ کتابیں ''اشاعت'' کا پل صراط عبور کر لیں گی۔

سوال۔ آپ نثر نگار بھی ہیں شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر۔

جواب: شاعری اور نثر دونوں اظہار کے وسیلے ہیں، مجھے دونوں یکساں مرغوب ہیں۔ میرے خیال میں موضوع اور اس کے حجم کو سامنے رکھ کر ہی وسیلہ اظہار کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ایک صنف سخن تمام موضوعات کا احاطہ نہیں کر پاتی اس لیے آپ کو اظہار کے لیے مختلف اصناف سخن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ موضوع کو بہتر اور موثر انداز میں بیان کرنے کے لیے ہر کوئی مختلف اصناف سخن کا سہارا لیتا ہے میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔

سوال: الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جاتا ہے۔

جواب: یہ بات سو ہان روح ہو چلی ہے۔ لوگوں نے بڑی ''رغبت'' سے کتاب بینی ترک کی ہے۔ میں تو یہاں بھی کہوں گا کہ ریاست جب جرائم کی روک تھام کے لیے اخبارات میں تاکیدی اشتہارات دے سکتی ہے۔ تو معاشرے میں بڑھتے ہوئے بگاڑ کو روکنے، تحمل و برداشت کو فروغ دینے اور، تہذیبی و ثقافتی قدروں کی نمو کے لیے الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا کے ذریعے کتاب بینی کو فروغ کیوں نہیں دیتی۔ (مکمل انٹرویو اندرونی صفحات پر)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 23 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 23 مارچ 2022 شمارہ 2

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیران ◉ حسن عباسی ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس ادارت}

◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ سعدیہ سیٹھی

{مجلس مشاورت}

◉ ظفر خان (برطانیہ) ◉ ارشد نذیر ساحل (چین)

کمپوزنگ • زوہیب کمپوزنگ : 0321-4730769 ڈیزائنر • نعمان حسن: 0333-4918383

سرورق: عمران شناور

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الحمید و سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 نازاوکازوی : 0301-4492133

nastallque786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی نمبر پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبائل کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ بیرون ملک کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت 2

مضامین:

○ زاہد منیر عامر کی تخلیقیں / جمیل یوسف 3

○ فکر فراواں / نسیم سحر ' 7

○ جدید اردو شاعری کا اہم نام..... قمر رضا شہزاد / نعیم شناس کاظمی ' 8

○ فسوں کار / پروفیسر قدرت اللہ شہزاد ' 11

○ انتظار حسین - اردو ادب کی نامور شخصیت / نوید مرزا ' 12

○ اکیسویں صدی کی نثری نظم اور ڈاکٹر وحید الدین خان / ڈاکٹر ساحل سلہری ' 13

○ چل دیے تم کہاں / لبنیٰ صفدر ' 15

○ سات رنگوں کا شاعر..... فراست رضوی / شاعر علی شاعر ' 16

○ ابن ساجد سعیدی کا نعتیہ مجموعہ "حسن ازل" مناقب کا مرقع / پروفیسر ڈاکٹر محمد نعیم محسن ' 22

○ سیرت محبوب رب العالمین ﷺ اور بشریٰ رحمن / علامہ عبدالستار عاصم ' 24

○ دکھی کیوں ہو؟ / ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ' 27

○ کے آوازوں / نازاوکازوی ' 29

○ اسیر عابد بطور مترجم "دیوان غالب" / ثاقب تبسم ثاقب ' 31

شاعری 35 تا 38

سفرنامے:

○ جاپان کا اردو بازار / عامر بن علی ' 39

طنز و مزاح:

○ جوڑوں کے درد / امجد محمود چشتی ' 40

○ داد بیداد / پروفیسر نور کمال شاہ ' 41

○ حافظ مظفر احمد گڑھی شاہوی / ابرار ندیم ' 43

بقیہ انٹرویو: محمد حمید شاہد / 44

نعیم ضیاء / 51

افسانچہ: ○ مری والے / پروفیسر عاصم بخاری ' 53

○ مختصر ادبی خبریں ' 54

○ نامہ ہائے احباب ' 56

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد

نجانے کیا ہے ملال صاحب
ازل سے آنکھیں ہیں لال صاحب
کوئی تو آتش فشاں ہے مجھ میں
کہ سرخ رہتے ہیں گال صاحب
یہ آنسو یونہی نہیں نکلتے
بہت ہے اندر اُبال صاحب
یہ کس نے دھکا دیا ہے ہم کو
یہ کس نے کھینچے ہیں بال صاحب
ہمیں ہے خواب و خیال ہونا
ہمارا رکھنا خیال صاحب
ہے اتنا وافر کہ یونہی ہر سُو
بکھیرتے ہو جمال صاحب
تمہارے آنگن میں گم ہوئی ہے
ہمارے بچوں کی بال☆ صاحب
لحد لحد میں بدن کا سونا
بہت بناتے ہو مال صاحب
تمہاری نظروں سے گر کے ہم تو
بہت ہوئے پائمال صاحب
سیاہ ظاہر سیاہ باطن
نظر سے اپنی اُجال صاحب
یہ تالیاں ہیں کرم تمہارا
وگرنہ سُر ہے نہ تال صاحب

حسن عباسی/لاہور

نعت

ہے غبارِ راہِ بطحا میرے سر پر دوستو
اوج پر ہے کس قدر اپنا مقدر دوستو
فرطِ دردِ ہجر سے آنکھیں ہوئیں تر دوستو
خم ہے اظہارِ تشکر میں مرا سر دوستو
جانبِ شہرِ پیمبرؐ ہے مرا عزمِ سفر
بخت ہے تاروں سے بھی میرا منور دوستو
خود بخود بڑھنے لگی ہیں منزلیں میری طرف
عشق سالارِ اُمم ہے میرا رہبر دوستو
سامنا ہے گرچہ اک لمبی مسافت کا مجھے
ہر قدم پر رحمتیں بھی ہیں برابر دوستو
ساغرِ جمشید سے بھی ہیں زیادہ قیمتی
میری نظروں میں رہِ بطحا کے کنکر دوستو
کر گئے بوصیری و حسان و کعب اُن کی ثنا
کیا لکھیں گے آج کل کے یہ سخن ور دوستو
ان سے دعوائے محبت کا تقاضا ہے یہی
اتباع ان کی کرو مثلِ ابوذر دوستو

ڈاکٹر محمد افتخار الحق ارقم/گجرات

جہاں میں اُن کی طرح خوش خصال کوئی نہیں
وہ بے مثال ہیں اُنؐ کی مثال کوئی نہیں
مدینے پاک میں جو بھی گیا خدا کی قسم
وہ خوش نصیب ہے اُس سا نہال کوئی نہیں
یوں آفتاب و قمر کہہ رہے ہیں، اُنؐ جیسا
حسین کوئی نہیں پُر جمال کوئی نہیں
ہر ایک بات محمدؐ کی کر رہی ہے اثر
جہاں میں آپؐ سا شیریں مقال کوئی نہیں
نہیں ہے دوسرا کوئی جو چاند کو توڑے
ہنر میں انؐ کی طرح باکمال کوئی نہیں
بدل دیے ہیں محمدؐ نے رُخ ہواؤں کے
میرے حضورؐ سا روشن خیال کوئی نہیں
حضورؐ آئے تو شاداب ہو گئے صحرا
کہ آپؐ سا تو یہاں نیک فال کوئی نہیں
حسنؓ کہ فاطمہ یا ہوں حسین ابنِ علیؓ
نبیؐ کی آل کے جیسی تو آل کوئی نہیں
یہ کہہ رہے ہیں فرشتے بھی، جن و انساں بھی
حضورؐ جیسا فقید المثال کوئی نہیں

ریاض ندیم نیازی/بی

منور و پُرکیف سارا سماں ہے
ثنائے محمدؐ سے روشن جہاں ہے
بلالؓ اور سلمانؓ پہ قربان میں بھی
مرے عشق میں ان سی مستی کہاں ہے
ترے چار سو بری توحید چھم چھم
ابھی بھی اے غافل تو محو بتاں ہے
لبوں پر ہے صلِ علیٰ کا ترانہ
مدینے کی جانب سفینہ رواں ہے
بنایا ہے پہلے رسولِ امیںؐ کو
حقیقت یہ آدم سے پہلے عیاں ہے
بنے ہیں مرے نین ان کے لیے ہی
ثنائے نبی کے لیے یہ زباں ہے
کرم کا کنارہ نہیں کوئی حالی
کرم ان کا مجھ پر ہوا بے کراں ہے

محمد ذوالقرنین جواد حالی/حاصل پور

☆ Ball

زاہد منیر عامر کی نظمیں

جمیل یوسف/ مری

جناب زاہد منیر عامر کی نظمیں عصر حاضر کے انسان کے شعور و احساس کا آئینہ ہیں جس میں اس کی روزمرہ زندگی کے شب و روز جھلکتے ہیں۔ کائنات کی بے کراں وسعتوں میں اسے اپنے وجود کی بے بسی اور فنا پذیری کا احساس ستاتا ہے۔ اس کا خوبصورت شاعرانہ اظہار ''ایکویریم'' میں ملتا ہے۔

''میں پانی میں تھا
اور پانی سے میرا بدن بن رہا تھا
میں پانی میں ہوں
اور کچھ بلبلے میرے جینے کا سامان ہیں''

یہاں میر کے اس شعر کا خیال آتا ہے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بُلبُلہ ہے پانی کا

مگر بات آگے بڑھتی ہے، زاہد منیر شاعر کہتے ہیں

''میرے سامنے وسعتیں بیکراں ہیں / مگر نارسائی ہے حدِ نظر تک / میں شیشے کی دیوار میں قید ہوں اور / انہی پتھروں میں مجھے ڈھونڈتا ہے / وہ نغمہ کہ جس سے رواں ہے یہ پانی / مری آگ پانی میں رکھ دی گئی ہے''۔

یہی انسان کا المیہ ہے اور یہی اس کا مقدر ہے۔ ان کی نظم ''آنکھوں میں چُبھتے موتی'' انسان کی بے بسی اور نارسائی کی ایک اور تصویر سامنے لاتی ہے۔

آنکھوں میں چبھتے لفظوں / ہاتھوں میں چھپے لیکھوں / ! سینوں میں دبے جذبوں کو / کس نے یہاں سمجھا / ہر ایک کی دنیا کے کچھ اپنے مسائل ہیں / جب وقت مہکتا ہے / ہر شاخ پہ شادابی / مستی میں لہکتی ہے / جب وقت نمو بن کر / شاخوں سے ٹپکتا ہے / اس وقت بھی دنیا کو / اس حسن سے ملنے کی / فرصت ہی نہیں ملتی..... / ساحل سے سفینوں کو / ملتا ہے اشارا جب / آنکھوں میں چھپے موتی / کرتے ہیں کنارا جب / ہر رنگ بدلتا ہے / کہنے کو تو کہتے ہیں / اے کاش نہ تم جاتے / لیکن کسے فرصت ہے / رک کر وہ ہمیں تھامے / اور کون ہے جو روکے / ہر ایک کی دنیا کے / کچھ اپنے مسائل ہیں''۔

مگر زاہد منیر عامر رجائیت اور امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انسان کی تمام نارسائیوں کے باوجود اور خزاں کی تمام تباہ کاریوں اور یخ بستگی کے باوجود وہ مایوسی یا ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے۔ بہار کی آمد کا مژدہ جاں فزا سناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خزاں کی یخ بستگی اور پھر بہار میں پھولوں کی مسکراہٹ شاعری میں ڈھل کر استعاراتی روپ دھار لیتے ہیں۔ جس طرح ایک انگریزی شاعر نے کہا ہے

If Winter comes, Can spring be far behind

اس ضمن میں زاہد منیر عامر کی نظم بعنوان ''ایران کی پہلی نظم'' ملاحظہ ہو۔

''اگر سردی نے سب کچھ سرد کر ڈالا ہو / اس کی لہر باطن تک سرایت کر چکی ہو / پھول کھلتے ہوں، نہ کوئی شاخ ہلتی ہو / چمن کے چہچہے خاموش ہوں / اور آبشاروں کے ابلتے پانیوں میں / زندگی کی لہر جمتی جا رہی ہو / سخن میں ساز ہو کوئی، نہ خوابوں میں کوئی خوشبو / اچانک اک دریچہ آسماں سے صبح کا پیغام لے آئے / سخن میں ساز اور خوابوں میں خوشبو لوٹ آئے / رکے پانی رواں ہوں / زمزمے منقار سے پھوٹیں / کرن پھولوں میں ڈھل کر / شاخچوں پر رقص کرتی ہو / چمن معمور ہو جائے / حرارت سے / محبت سے / بہت مشکل سہی لیکن / کسی دن ہو تو سکتا ہے''۔

اب محترم جناب ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے بارے میں ایک نہایت خوبصورت نظم ''سمے کا پارکھ'' دیکھیں۔

''گزرتے وقت! اس کی مانگ میں عمر گریزاں کا نہ کوئی رنگ بھرتا / چمکتی، وقت کے اُس پار تکتی، دور اس آنکھوں کے روشن آئینے میں / بال مت لانا / .....زمانے کی سماعت کو / جو کومل سُر میسر ہے / اسے مت چھیننا / ..... / کہانی کا ہر اک کردار / اپنا راز اس پر کھولتا ہے / زمانے سُن! / ابھی وہ بولتا ہے''۔

اپنے ایک اور استاد محترم جناب پروفیسر چودھری عبدالحمید صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی نظم ''کرن، خاک اور خواب'' میں لکھتے ہیں۔

''تمہارے شب و روز تو خارزاروں میں بیتے / مگر تم مہکتے گلابوں کی دُھن میں / انہی خارزاروں میں خوشیاں اگاتے رہے / تمہیں تھے / جسے خاک آلودہ کرنوں سے اتنا شغف تھا / کہ کرنوں کو سورج بنانے کی دھن تھی / تم خود کرن تھے / چمکتی ہوئی اور مہکتی کرن تھے / تمہاری کرن خاک سے خواب تک کا سفر کر رہی تھی / ابھی میرے سینے میں زندہ ہیں وہ لفظ / جن کی حرارت / تمہاری نگاہوں میں لو دے رہی

تھی''۔

علامہ اقبال نے اپنے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال پر کئی اشعار لکھے ہیں بلکہ ایک پوری کتاب ''جاوید نامہ'' جس کو وہ اپنی شاعری کا شہکار سمجھتے تھے کا نام ہی اپنے بیٹے کے نام پر رکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے بیٹے کے لئے ان کے دل میں کیا کیا آرزوئیں تھیں، کیا کیا تمنائیں تھیں۔ ہر محبت کرنے والے باپ کے دل میں اپنے بچوں، خاص کر کسی ایک بچے کے لئے ایسے ہی خواب ہوتے ہیں..... شاذونادر ہی وہ خواب پورے ہوتے ہیں۔ سوائے ڈاکٹر جاوید اقبال کے شاعروں کے بیٹے تو علم ودانش میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دے سکے، بلکہ عموماً گمنام ہی گزر گئے ہیں۔ جاوید اقبال ایک ایسی استثنائی شخصیت تھے جس کی مثال نہیں ملتی۔

جناب زاہد منیر عامر کے سارے بچے ماشاء اللہ غیر معمولی طور پر ذہین اور طباع ہیں مگر خصوصی طور پر ان کا بیٹا سروش اور بیٹی ندیا حیران کن حد تک لائق اور ذہین ہیں۔ ابھی سکول کے درجوں میں ہیں مگر ان کی تخلیقی اور تصنیفی اُپج کا اظہار ہو رہا ہے۔ زاہد منیر عامر صاحب نے سروش پر جو نظم لکھی ہے وہ علامہ اقبال کے جاوید اقبال کے بارے میں اشعار سے بڑھ کر شاعرانہ اظہار اپنے اندر رکھتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

''تمہارے لہجے میں گنگناتے ہیں وہ زمانے/ جو آنے والے دنوں میں گم ہیں

چمکتی آنکھوں کے دائروں میں/ کرن ہے، جس میں نیا زمانہ دمک رہا ہے

ھنکھتے لفظوں میں صبح فردا کی آہٹیں ہیں/ مری بصارت، میری سماعت

رُواں رُواں ڈوبتے بدن کا/ اسی زمانے کا منتظر ہے/ کہ جب تمہارا وجود ہوا ایک استعارہ حیات افروز روشنی کا''

شاعر کو کبھی وہ دن یاد آتے ہیں جب محبت کا جذبہ پہلی دفعہ اس کے دل میں بیدار ہوا تھا اور زمین وآسمان کے منظروں پر ایک نئی روشنی کی چھوٹ پڑی تھی۔ یہ ایک نئی آگہی تھی جس سے شاعر کا وجود پہلی دفعہ آشنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی عنفوانِ شباب کا لمحہ شاعر کو یاد کے دریچوں سے پھر اپنی جھلک دکھاتا ہے اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

''یہی دن تھے کہ سینے میں کوئی شے کسمساتی تھی/ یہی دن، آسمانوں سے ستاروں کے اترنے کے/ یہی دن چاند کو دن رات ان آنکھوں میں بھرنے کے/ یہی دن روشنی میں شمع جاں کو آزمانے کے/ یہی دن لفظ کو جذبے کی خلعت سے سجانے کے/ یہی دن روٹھ جانے کے/ یہی دن مان جانے کے/ یہی دن تھے کہ خود کو اپنے گنبد سے نکالا تھا/ شفق پھوٹی، سحر آئی کسی پنچھی نے پَر کھولے/ نگہ اٹھی، قدم لرزے، یکا یک آسمان ڈولے/ سماعت نے ہر اک آواز میں امرت کا رس پایا/ نگاہوں میں زمین وآسماں کا حسن لہرایا/ زمانہ نور میں ڈوبا تمنا کا فسوں جاگا/ یہی دن تھے کہ ہر جانب تمنا رقص کرتی تھی/ ہواؤں نے سمندر کے اچھلنے کی بشارت دی/ سمندر نے صدف کی مانگ بھرنے کی بشارت دی/ لہکتی ڈال ہاتھوں میں مہکتے پھول لے آئی/ ہوا خوشبو میں، خوشبو آرزوؤں میں سمٹ آئی/ مری آنکھوں میں پہلی بار اشکوں کی گھٹا چھائی/ یہی دن تھے''۔

اوپر کی نظم میں جس نئے نویلے جذبے کا اظہار ہے، وہی کنوارا جذبہ کروٹیں لیتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور ''محبت امتحان ہے'' میں نئے مرحلہ ہائے شوق طے کرتا ہے۔

''ذرا دیکھ گزرتے روز وشب کو/ ہر اک لمحہ ستارا ہے/ اگر تسخیر ہو جائے تو یہ لمحہ تمہارا ہے/ تمہارے خوبصورت ہاتھ میں کتنے ستارے ہیں/ انہیں تسخیر کر لو تو تمہاری مانگ میں یہ سب ستارے جگمگائیں گے/ ستارے اور آئیں گے/ فلک بھی اور آئیں گے/ اگر تم روشنی سے دوستی کر لو/ تو یہ جانو کہ ہر لمحہ محبت کا نشاں ہے/ محبت امتحاں ہے''۔

اب محبت کا سفر نئے عزم اور نئے ولولے سے جاری ہے۔ ''محبت آزمائیں گے'' میں

''تمہیں/! اب ہم، نہیں روٹھیں گے/ اب ہم آسمانوں سے اترتے پیار کے پیغام کا رستہ نہ روکیں گے/ نہیں، ہم/ شاخچوں پر کوکتی کوئل کے نغموں کو سنیں گے/ پھول کے دل میں اترتی/ لمحہ لمحہ ڈوبتی منقار دیکھیں گے/ سحر دم ہر رخِ زیبا پہ لکھی آس اور امید کی تحریر پڑھ لیں گے/ ستاروں کے سفر میں چاند کی منزل کو پائیں گے/ محبت آزمائیں گے/ چلو! نازک لبوں سے پھوٹتی کلیوں کی اک مالا بنائیں/ اور اسے زیب گلو کر لیں/ نگاہوں میں اترتے ساونوں سے ہم نئے منظر بنائیں گے/ نئی دنیا بسائیں گے/ محبت آزمائیں گے''۔

اب شاعر اپنی محبوبہ سے ایک نئے زاویئے سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''نظم تم سے کلام کرتی ہے''۔

''نظم تم سے کلام کرتی ہے/ آسمانوں کے نور ونکہت میں/ خوشبوؤں کی حسیں رنگت میں/ لفظ ومعنی/ اٹوٹ سنگت میں/ نظم کے تانے بانے بنتے

ہیں/ میٹھی یادوں کے پھول چنتے ہیں/ نظم تم سے کلام کرتی ہے/ صبح کے سیمگوں اجالے میں/ روشنی کے لطیف ہالے میں/ چار موسم جو یہ ہمارے ہیں/ یہ عناصر کے استعارے ہیں/ رنگ جتنے ہیں سب تمہارے ہیں/ یا دلفظوں میں رنگ بھرتی ہے/ نظم تم سے کلام کرتی ہے''۔

اب شاعر والہانہ محبت کی راہوں پر گامزن ہے اور اس کی کیفیت وہی ہے جو فیض نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے۔

تیری صورت جو دل نشیں کی ہے آشنا
شکل ہر حسیں کی ہے

نظم ملاحظہ ہو''تراعکس آئینوں میں''

''یہ وہ تجربہ ہے جس میں/ کوئی حد نہیں مکاں کی/ مرے بحر بیکراں کی/ جو ازل سے بہہ رہا ہے/ سر ساحل زمانہ/ یہ جو رنگ روپ چہرے/ مرے ہر طرف سجے ہیں/ یہ تمام آئینے ہیں/ ترے عکس دل نشیں کے/ یہ جو پھول سے گزر کر/ مری روح سمائی/ یہی خوشبوئے فروزاں/ مجھے جگمگا رہی ہے/ وہ کلی جو کھل گئی ہے/ دبے پاؤں اس روش پر/ سر راہ بچھ گئی ہے/ تری یاد آرہی ہے''۔

اور اب اپنی محبوبہ کے لئے شاعر کی دعا۔

''جو ستارے چمکدار آنکھوں میں ہیں/ وہ دمکتے رہیں/ جو اجالا ترے پھول ہونٹوں پہ ہے/ وہ نکھرتا رہے/ کہکشائیں کہ جو تیرے گالوں میں ہیں/ وہ سنورتی رہیں/ موج خوشبو کی جو تیرے گلشن میں ہے/ وہ مہکتی رہے/ تیرے آنچل کے موتی چمکتے رہیں/ تیری افشاں کی کرنیں لپکتی رہیں/ خواب آنکھوں پہ تیری اترتے رہیں/ لفظ ہونٹوں پہ تیرے مہکتے رہیں/ خالی رُخ کی چبھن/ ہاتھ کنگن کی چھن/ تیرے من کی لگن/ ہو کبھی بھی نہ کم/ تو سدا زندگی کا سہارا ہے''۔

میرا ایک شعر ہے:

ہمارے عہد محبت سے کیا رہا باقی
اداس کرنے کو بس اک نام باقی ہے

یہ شعر مجھے زاہد منیر عامر صاحب کی نظم ''اداسی کو بہانہ مل گیا ہے'' پڑھ کر بے ساختہ یاد آ گیا۔ ان کی نظم دیکھیں، بہت عمدہ نظم ہے۔

''اداسی یوں تو اس دھرتی کی مٹی میں گندھی تھی/ گھنے اشجار سے پتوں کی صورت پھوٹتی تھی/ فضا میں نیم سرگوشی کی آوازوں میں ڈھل کر/ اداسی کی خنک لہریں رگِ جاں میں سرایت کرتی جاتی ہیں/ سمندر سے اداسی ڈولتی/ بل کھاتی، ساحل سے گریزاں/ جب کبھی لنگر اٹھاتی تھی/ چمکتے موتیوں کے ہار اپنے ہاتھ میں لے کر/ اسی دھرتی کی جانب لوٹ آتی تھی/ یہ سب کچھ تھا/ مگر تب تک تمہیں دیکھا نہیں تھا/ تمہیں دیکھا، تمہاری یاد کے غُنچے کھلے اور پھر/ گھنے اشجار پر/ دھرتی کے شرق و غرب میں پھیلی/ ترنم آمیز آوازوں/ فضاؤں اور ہواؤں میں/ چمکتی قوس میں/ اور آسمانوں سے اترتے موتیوں کی آبشاروں میں/ سرِ ساحل، سر صحرا اداسی ہی اداسی ہے/ اداسی کو بہانہ مل گیا ہے''۔

اب آگے میرے سامنے ایک بڑی خوبصورت نظم ہے''ستارے میرے مونس ہیں''۔ اس میں سے ایک اقتباس۔

''ستارے میرے مونس ہیں/ بہت تاریک راتوں میں میرے ہمراہ چلتے ہیں/ مری افسردگی کو دیکھ کر، افسردہ ہوتے ہیں/ مجھے جب قعرِ غم میں ڈوبتا دیکھیں/ تو مجھ پر مسکراتے ہیں/ مجھے باہر بلاتے ہیں/ اندھیرے لاکھ ہوں لیکن/ ستارے جگمگاتے ہیں/ مجھے رستہ دکھاتے ہیں''۔

اور اب ایک اور بہت اچھی نظم بڑا خوبصورت شاعرانہ اظہار، نظم کا عنوان ہے''کہاں ہو تم''

''کہاں ہو تم/ تمہاری کچھ خبر آتی نہیں ہے/ سنا یہ تھا/ بلندی پر پہنچ کر سب نظر آتا ہے لیکن/ تمہاری صورتِ زیبا نظر آتی نہیں ہے/ نہ وہ آواز ہے جس کی نشیلی گنگناتی آہٹوں میں/ پھول کھلتے ہیں/ اجالے مجھ سے ملتے ہیں/ نہ وہ رفتار جو کلکِ قدم سے/ اک پیام آسمانی کو/ زمینی زائچوں میں نقش کرتی ہے/ صبا جس سے بہت بچ بچ کے چلتی ہے''۔

زندگی کا ایک اور رُخ۔ ایک اور تلخ حقیقت۔

''مجھے جلدی بہت تھی/ اس لئے/ جملے بھٹکتے تھے/ بہت سے لفظ باتوں میں/ نشست اپنی بدلتے تھے/ بہت سرگوشیاں/ میری سماعت پر اترتی تھیں/ سماعت سے ذرا آگے مگر جلدی کا پہرا تھا/ میں سنتا تھا پر بہرا تھا/ سرِ راہ ریختہ پتوں کو سننے/ پھول چننے/ نشیلے بادلوں کو دیکھنے کی بھی، ذرا فرصت نہیں تھی/ مجھے جلدی بہت تھی''۔

اب ہم زاہد منیر عامر کی ایک اور نظم پڑھتے ہیں۔

''حقیقت واہمہ ہے''۔

''حقیقت آنسوؤں میں ڈھل کے بہہ جاتی ہے آنکھوں سے/ ہماری آرزوئیں بھی/ فقط صحرا کے چشمے ہیں/ کسی چہرے کی زیبائی/ کوئی رفعت، کوئی عظمت/ کوئی دانائی، رسوائی، یہ سب اک کینوس پر/ جا بجا رنگوں کے دھوکے ہیں/ اگر رنگوں کو ہم چھو لیں/ تو یہ سب نقش مٹ جائیں/ حقیقت واہمہ ہے/

آنسوؤں میں ڈھل کے بہہ جاتی ہے آنکھوں سے''۔

نظم ''لرزتی لہروں کا خاموش فیصلہ'' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ روزمرہ زندگی کی ایک جانی پہچانی اہم حقیقت کا خوبصورت شاعرانہ اظہار ہے۔

''بہت جلدی میں تم نے فیصلہ اپنا سنایا ہے/ ابھی تو موسموں کی ڈالیوں پر پھول کھلنا تھے/ ابھی تو ابر کو چاروں طرف سے گھر کے آنا تھا/ ابھی کچھ حرف تھے جو لفظ کی صورت کو تکتے تھے/ ابھی تو عمر کے بادل سرِ صحرا چمکتے تھے/ یہ تم نے کیا کیا/ جلدی میں ایسا فیصلہ.....اور یوں/ چراغ دل کی لو اس فیصلے سے ڈگمگائی ہے/ چمکتی صبح کی کلیوں پہ کیسی رات چھائی ہے/ وہ دھرتی مدتوں جو قطرہ شبنم کو ترسی ہے/ تمہارے فیصلے نے کس طرح سیراب کر ڈالی/ ذرا دیکھو محبت کس طرح آنکھوں پہ برسی ہے/ محبت کا تقاضا تھا کہ تم کچھ دن ٹھہر جاتے/ وہ دن جن پر تمہارے پیار کے کچھ حرف اترے تھے/ وہ ان سے سائبان بن کر/ زمانے کی چمکتی دھوپ میں کچھ دن اماں پاتے/ مگر تم کو تو جلدی تھی/ تمہارے سانس کی لہریں لرزتی تھیں/ محبت کو نگاہوں میں تڑپتا چھوڑ کر/ تم نے یہ کیسا گھر بسایا ہے/ یہ وہ منزل ہے جس میں کوئی اپنا نہ پرایا ہے/ بہت جلدی میں تم نے فیصلہ اپنا سنایا ہے''۔

حفیظ جالندھری کا شعر ہے:

بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والے
کوئی کم بخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے

اس دیوانگی کا علاج شاعر نے اپنی نظم ''ابھی کچھ کام باقی ہیں'' سے کیا ہے۔

''ابھی کچھ کام باقی ہیں/ کتابوں سے گزر کر دل میں جا بیٹھا ہے جو/ وہ نام مٹنا ہے/ کسی گنجینۂ امروز کو/ ماضی کا پیراہن پہننا ہے/ ابھی پھولوں سے اور پھولوں کی خوشبو سے/ مجھے آگے گزرنا ہے/ لکیروں میں ابھرتی صورتوں کو محو کرنا ہے/ تمنا کی جہانگیری بہت دن دیکھ لی میں نے/ حقیقت کو/ تمنا کے سرابوں سے/ بس اب آزاد کرنا ہے''۔

مولانا رومیؒ نے کہا تھا:

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما
اے علاج جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

مولانا رومی کے مندرجہ بالا اشعار مجھے زاہد منیر عامر صاحب کی نظم ''محبت! شکریہ تیرا'' نے یاد دلا دیئے ہیں۔

''میں اک تنہا شجر/ سورج کی حدت میں پگھلتا تھا/ گزرتے وقت میں گرہوں پہ گرہیں پڑتی جاتی تھیں/ کوئی بادل مرے آکاش پر کم ہی اترتا تھا/ پھر اک دن یوں ہوا/ بادل نے مجھ سے دوستی کر لی/ مرے آکاش پر اترا/ مجھے دیکھا/ مجھے سرشار کر ڈالا/ مری سوچوں میں رعنائی/ سماعت پر مری دستک/ مری آنکھوں میں خواب اترے/ محبت! شکریہ تیرا''۔

اور اب ایک اور نظم پڑھ کر مجھے کسی شاعر کا یہ مصرعہ یاد آ گیا ہے۔

ہیچ سخنِ تلخ بہ معشوق نہ گفت

نظم ہے ''نہیں ایسا نہیں کہتے''

''نہیں ایسا نہیں کہتے/ ستارے آسماں کی وسعتوں کو زیب دیتے ہیں/ مہکتے پھول اپنی ڈالیوں پر اچھے لگتے ہیں/ سہانے دن تمازت سے چمکتے ہیں/ وہ جس سے اپنے دل کے آستانے کو سجاؤ تم/ جسے اپنا بناؤ تم/ اسے پھر آسمانوں کی بلندی پر بٹھاؤ تم/ مگر ایسا نہ ہو اس کو گراؤ تم/ تمہیں معلوم ہے جب روشنی نیچے اترتی ہے/ سوا نیزے پہ ہوتی ہے/ قیامت ساتھ لاتی ہے/ نہیں ایسا نہیں کرتے/ نہیں ایسا نہیں کہتے''۔

''محبت سے پہلے'' بھی اسی سلسلے کی نظم ہے اور خوب ہے۔

''محبت سے پہلے/ کسی روپ میں دل کشی نے بسیرا کیا ہی نہیں تھا/ چمکتی نگاہوں سے اس آئینے پر/ کرن کوئی اتری نہیں تھی/ جہاں اب ستاروں کے جھرمٹ سجے ہیں/ کسی زلف کے بل میں دل کے الجھنے کا/ امکاں کب تھا/ محبت سے پہلے/ محبت سے پہلے یہی پھول تھے/ ان میں خوشبو نہیں تھی/ یہی چاند تھا/ چاندنی کب تھی اس میں/ ستاروں میں ٹکڑے نہ تھے میرے دل کے/ مرے شہر کے موسموں میں تھی شدت/ مگر ان میں کوئی حرارت نہیں تھی/ حرارت نہیں تھی/ محبت نہیں تھی/ نئے دن تو آتے تھے لیکن/ نئی بات ان میں کہاں تھی/ مگر اب جہاں تک نظر ہے نئے راستے ہیں/ نئی زندگی اور نئے روز و شب ہیں/ نئے سلسلوں میں سجی ہیں بہاریں/ دنوں میں ہے ساون/ تو راتوں میں شبنم/ کھنکتا ہے لہجہ/ چمکتے ہیں لمحے/ محبت سے پہلے تو کچھ بھی نہیں تھا''۔

❀❀❀❀❀

''فکرِ فراواں''

نسیمِ سحر/ اسلام آباد

قبل ازیں مجھے جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کے مجموعۂ حمد ونعت ''عودِ نگر'' اور مجموعۂ غزلیات ''شمعِ خیال'' پر اظہارِ خیال کا موقع ملا۔ اب ان کا ایک اور مجموعۂ کلام ''فکرِ فراواں'' کے عنوان سے میرے سامنے ہے۔ آغاز میں ہی انہوں نے قطعات کی صورت میں اپنی آبائی حویلی کی کچھ یادیں جمع کی ہیں جو اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ زیادہ تر کلام سیاسی، طنزیہ اور مزاحیہ منظومات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی طویل نظم ''آمر نامہ'' میں کھل کر فوجی آمروں پر لکھا ہے اور برملا کہا ہے کہ آئینِ پاکستان کو ختم، معلق یا معطل کرنا سنگین جرم ہے جس کی سزا موت یا عمر قید ہے۔ انہوں نے جہاں فوج کی بطور ادارہ اہمیت کو ایک عمدہ نظم ''پاک فوج کی وردی'' لکھ کر اس کی جرأت، عظمت اور شان کو بیان کیا ہے، وہیں بعض فوجی آمروں کے کردار کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ یہ مثبت تنقید نیک نیتی سے شائستہ اظہارِ رائے، یعنی Fair Coment کی تعریف میں آتی ہے جو بطور ادارہ فوج کے بارے میں نہیں ہے۔ حُسنِ نیت کی تصویب نظم ''پاک فوج کی وردی'' سے ہوتی ہے۔ اسی لیے میاں نذیر اختر نے ان اشعار کو درست سیاق وسباق میں پڑھنے کی ضرورت پر بجا طور پر زور دیا ہے۔

اس کتاب میں شامل طنزیہ ومزاحیہ کلام ایسا نہیں جسے محض تفریحِ طبع کی خاطر پڑھا جائے بلکہ میرے خیال میں یہ کلام بھی کتاب میں شامل دیگر عنوانات کے کلام کی مانند اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ یوں جانیے کہ قارئین کو کڑوی گولی کھلانے کے لیے اسے شوگر کوٹڈ کیا گیا ہے۔ طویل نظم ''آمر نامہ'' کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:۔

کالج کے زمانے سے ہی آزاد منش ہے
کہتے ہیں کہ مدّت سے قدح خوار ہے آمر
اعدا ہیں بہت ختمِ نبوّت کے وطن میں
اور ان کے مناصب کا نگہدار ہے آمر
ہندو سے بھی اُلفت کی بڑھانے لگا پینگیں
بھارت سے بھی قربت کا طلبگار ہے آمر

ایک مزاحیہ نظم کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

چلاتے ہیں ''جسٹس'' جہاں انصاف کی خاطر
گنتی میں کہاں آتے ہیں عمران وغیرہ
سرحد کی حفاظت کے لیے چین سے کہہ دو
حافظ ہوں معیشت کے تو جاپان وغیرہ
ٹی وی کی ہدایات پہ اولاد ہے چلتی
ماں باپ کا سنتی نہیں فرمان وغیرہ

اسی طرح ''لوٹا نامہ'' بھی مزاحیہ انداز میں سیاسی قلابازیوں پر طنزیہ اشعار پر مشتمل ہے جبکہ ''سویٹ ڈش'' کے عنوان سے بھی مزاحیہ قطعات شاملِ کتاب ہیں۔ ان میں سے دو قطعات بطور سویٹ ڈش نذرِ قارئین ہیں:

میٹھے لہجے میں جو کلام کرے
ایسے بندے کو دل سلام کرے
جو بھی حلوے کا اہتمام کرے
دل بھی پھر اس کا احترام کرے
وہ جو میرے قریب ہو جائے
حال میرا عجیب ہو جائے
ایسی قسمت کہاں کہ روزانہ
مجھ کو حلوہ نصیب ہو جائے

جسٹس میاں نذیر اختر کی سیاسی منظومات میں ملک وقوم کا درد جھلکتا ہے۔ مزاحیہ کلام میں بھی سنجیدہ فکر اور پیغامات موجود ہیں۔ اس لیے اس مختصر مجموعۂ کلام پر مبنی کتاب کا نام ''فکرِ فراواں'' بھی بہت جچتا اور سجتا ہے۔ آخر میں ایک نظم نذرِ قارئین:

راہنما

ظاہر میں دیکھیے تو وہ مشعل بدوش ہیں
پرکھیں تو رہنما سبھی ظلمت فروش ہیں
رکھا ہے مبتلا ہمیں سحرِ کلام میں
لفظوں کا ایک ظاہری جوش وخروش ہیں
ہوتے ہیں بات بات میں اعدا کے ہمنوا
لگتا ہے جیسے اصل میں ملّت فروش ہیں
اندھے ہیں دیکھ سکتے نہیں راہِ مستقیم
کلمۂ خیر کیا سنیں محرومِ گوش ہیں
بادہ و جام و رقص کے رسیا ہیں روسیاہ
وہ حامیانِ لہو و لَعب نا و نوش ہیں
یہ کیا کھلائیں گے بھلا صحنِ چمن میں پھول
ویرانیاں ہی لائیں گے صحرا بدوش ہیں
اختؔر نہیں ہے ان سے کسی خیر کی اُمید
روشن خیال و گمرہ و محرومِ ہوش ہیں

.....

جدید اُردو شاعری کا اہم نام......قمر رضا شہزاد

فہیم شناس کاظمی

۰۸۹۱ میں جب ہم نے فنون اور دیگر ادبی رسائل و جرائد پڑھنے کا آغاز کیا تو قمر رضا شہزاد کے نام سے واقف ہوئے ان کی غزل میں ایک تیکھا پن اور تازگی محسوس ہوتی تھی اور ساتھ میں ایک جوش اور جذبہ جس سے ان کی شاعری پڑھ کر اپنائیت کا احساس ہوتا تھا

ایک بار لاہور جانا ہوا تو ان کا مجموعہ ,,پیاس بھرا مشکیزہ،، نظر آیا (یہ وہ دن تھے جب نوابشاہ میں ادبی کتب نہیں ملتی تھیں ایسی کتب کے حصول کے لیے حیدرآباد یا کراچی جانا پڑتا تھا اور ہمیں اچھی شاعری کی تلاش رہتی تھی) سو فوراً خرید لیا اور بہت خوشی ہوئی اس مجموعے کا اُسلوب بہت منفرد اور احساس کی شدت لیے ہوئے تھا جس نے بہت متاثر کیا اور اپنے سب دوستوں کو یہ مجموعہ پڑھنے کو دیا۔۔وقت گزرتا رہا مگر اس نام اور کلام سے ایک اُنسیت ہمیشہ رہی۔ ہماری آوارگی کم ہو گئی سو کتب کا حصول بھی کم ہونے لگا۔بس ادبی رسائل کے ذریعے ادب سے سلسلہ جڑا رہا اور ہم قمر رضا شہزاد کا کلام پڑھتے رہے

گزشتہ دنوں قمر بھائی سے عالم اردو کانفرنس کے موقع پر ملاقات ہوئی تو سیر حاصل گفتگو بھی ہوئی، اور اس سے پہلے فیس بک پر ان کی آپ بیتی اور تازہ شاعری بھی پڑھنے کو ملتی رہی انہوں نے مجھے اپنی تمام کتب بھیجنے کا وعدہ کیا اور وہ وعدہ سچ بھی کر دکھایا یعنی اپنی پانچ کتب غزل کی چار خامشی، بارگاہ، یاد دہانی، شش جہات۔۔ اور ''اتمام حجت'' کے نام سے ایک نظمیہ مجموعہ عطا کیا۔

اچھی کتاب کا تحفہ مجھے دل سے خوشی عطا کرتا ہے اور جب اپنے پسندیدہ شاعر کی اتنی ڈھیر ساری شاعری مل جائے تو پھر تو کیا کہنے۔

قمر رضا عصر حاضر کے اُن شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اردو غزل کو اپنایا ظفر اقبال، صابر ظفر۔غلام حسین ساجد، خالد احمد جوان سے ذرا سینئر ہیں کی موجودگی میں اپنا چراغ اپنی ہوا اور فضا میں جلایا، یہ وہ مشکل مقام اور لمحہ تھا جب ایک سے ایک اعلی شاعر شہرِ سخن میں موجود تھا ایسے میں شکیب جلالی نے سب کو چونکا دیا اور ایسی غزل کہی جس نے فضا بدل دی جدید اردو شاعری اور غزل کے کئی دائرے ہیں ۸۰ اسی کی سے وہ دائرہ ہے جو ۲۰۲۰ تک قائم رہا یہ عہد ظفر اقبال اور صابر ظفر کے سائے میں رہا بہت کم شاعر ایسے تھے جو ان کے اثرات سے بچ سکے ہوں قمر رضا شہزاد بھی ان میں سے ایک ہیں جن کے اسلوب کی انفرادیت اور ان کی قلبی اور روحانی واردات ان سے مختلف اور جداگانہ رہی۔قمر رضا عزیز حامد مدنی اور یگانہ کے قبیلے کے آدمی ہیں۔جب پورا پنجاب واقعاتی اور چونکیاتی شاعری کے پیچھے بھاگ رہا تھا وہ اپنی بات بہت وقار اور اعتماد سے کہہ رہے تھے۔جہاں ساقی فاروقی ہانپ رہے تھے وہاں سے قمر رضا کی شاعری کا سفر آغاز ہو رہا تھا اور میرے نزدیک شاعری ہے بھی وہی، جو عصر حاضر میں ائندہ زمانوں کی سفیر ہو۔وقت اور زمان ومکاں جس کے پروں تلے سانس لیتے آگے بڑھتے نظر آئیں وہ جگمگاتی زندگی اور روشنی کا شاعر ہے اس کی اپنی لفظیات اور جہانِ معنی ہے اور رجائیت سے بھرپور کائنات ہے جہاں محبت اور تازگی ہے

مرے خیال میں اتنی بُری نہیں دنیا
یہ ہر کوئی اسے جتنا بُرا سمجھتا ہے

اک دوسرے سے خود ہی الگ ہو رہے ہیں لوگ
یہ راستہ کسی کو جدا کر نہیں رہا

مرے نہ ماننے والے ضرور دیکھیں گے
کسی زمانہ ءآئندہ میں ظہور مرا

راپین۔۔۔(rapin) نے کہا تھا ,,شاعری میں چند ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو بیان سے باہر ہیں جن کی کوئی توجیہہ یا توصیف نہیں کی جاسکتی۔انہیں شاعری کے سربستہ اسرار کہنا چاہیے، ایسے کوئی الفاظ موجود نہیں جو اُن لطافتوں اور دل پذیریوں کو بیان کر سکیں جو کسی واضح ادراک کے بغیر دل پر جادو سا اثر کرتی ہیں،، قمر رضا کی شاعری میں سیاسی اور سماجی شعور کی مشاہدات و افکار کے ساتھ ایسے بہت ساری لہریں رخ بدل بدل نئے رنگوں اور اجلے منظروں کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور تحیر میں مبتلا کرتی ہیں

اور گو انہیں اپنی غزل ہی سے زیادہ پیار ہے مگر انہوں نے نظم بھی کہی ہے,, اتمام حجت،، ان کی نظموں کا مجموعہ ہے اور اس میں بھی ان کا

اسلوب اظہار مختلف اور منفرد ہے۔ نظم ان سے خود اپنا اظہار کرواتی ہے اور زندگی کی اذیت نا کی کم کرنے میں ان کی مددگار رہے اسی لیے ان کی نظم میں وارفتگی اور ایک نوع کی شعلگی ہے ایک تڑپ اور اضطراب ہے ڈرامائی کیفیت ہے اور زندگی کی تلخی ہے سچائی کی شدت ہے اور بے ساختگی ہے۔ روحی بانو، قیامت، یہ کیڑے مکوڑے، کہاں ہوں ہوں میں تبدیلی، آخری آدمی، قرنطینہ مجھے بہت پسند آئیں۔

قمر بھائی آپ کی شاعری کسی اہم اور بڑے نقاد کی منتظر ہے میرے ان لفظوں میں صرف اس کا تعارف ہے اس شاعری کے پھول مہکنے کا زمانہ بہت نزدیک ہے جب ان کی مہکار ہر سو پھیلے گی اور اپنے خالق کی خلاقیت پر ناز کرے گی۔

انتخاب پیش ہے

بیان ہوگا ترا حسن ہر زمانے میں
ہمارے بعد بھی قصہ نگار آئیں گے
یونہی رہے گا کنارہ اداس یا کسی دن
ہمارے لوگ بھی دریا کے پار آئیں گے

.....

کبھی کبھی مجھے محسوس ہونے لگتا ہے
مرا خدا ہے جو محو کلام مجھ میں ہے
میں اپنے آپ تلک بھی پہنچ نہیں سکتا
یہ کیسی بھیڑ یہ کیا اژدہام مجھ میں ہے

.....

یہ دل کشادہ اور یہ آنگن بھرا رہے
سب کچھ بھی بانٹ کر مرا برتن بھرا رہے
جی بھر کے ہنس سکوں یہاں جی بھر کے رو سکوں
میرے وجود میں مرا بچپن بھرا رہے

.....

پہلے پہل تو میں ہی اکیلا فلک پہ تھا
اور اب ادھر بھی عالم اشیا روانہ ہے
مت جھانک میری آنکھ کی گہرائی میں یہاں
آنسو نہیں ہیں خون کا دریا روانہ ہے

.....

خدا کے نام پہ کرتا ہوں قتل عام بھی میں
کمال یہ ہے کہ اس پر ہوں نیک نام بھی میں
اب اس سے بڑھ کے کوئی بے بسی بھی ہوتی ہے
یہ سلطنت بھی مری اور یہاں غلام بھی میں

.....

ہر طرف تھی مری تلاش اور میں
اپنے قبضے سے واگزار ہوا
کیا سمندر عبور کرتا میں
ایک آنسو نہ مجھ سے پار ہوا
میں کتنے زمانوں سے گزر آیا ہوں لیکن
جیسے تھے مرے اب بھی خدوخال یہی ہیں
اے حسن تجھے کاش کبھی ان کی خبر ہو
تو جن سے گریزاں ترے بے حال یہی ہیں
سنے گا دکھ بھرا قصہ خدا ضرور مرا
زیادہ دور نہیں مجھ سے کوہِ طور مرا
مجھے نہ ماننے والے ضرور دیکھیں گے
کسی زمانہ ِ آئندہ میں ظہور مرا

.....

میں ایک حوضِ خنک کی طرف روانہ ہوں
بھڑکتی آگ ترے درمیاں سے ہوتے ہوئے

.....

ضرور میری سمت سنگ پھینکیے
میں ان سے اک آئینہ بناوں گا
یہ جنگ ہے تو پھر مرے عزیز میں
مکان کو بھی مورچہ بناوں گا

.....

لے گئے جھولیاں بھر بھر کے مجھے شہر کے لوگ
اپنے حصّے میں بھی آیا نہ بچایا ہوا میں
رات دن دیکھتا رہتا ہے مجھے عرش نشیں
اک تماشا ہوں سرِفرش لگایا ہوا میں

.....

گدڑی، چراغ، تیغ، ستارہ، علم، کتاب
حسبِ طلب مجھے مرا سامان مل گیا
بچپن کے چند ٹوٹے کھلونوں میں کل مجھے
رومال سے بندھا کوئی پیمان مل گیا

.....

یہ کائنات جو میرے لیے جہنّم ہے
کسی گناہ کا ممکن ہے شاخسانہ ہو
یہ ہر طرف جو بھڑکتی ہے آگ ممکن ہے
ابھی یہاں کسی نمرود کا زمانہ ہو

.....

میں خیر ہوں کہ شر مجھے بتایئے
مرا کہیں شمار ہو نہیں رہا
یہ شہر جل رہا ہے اور کمال ہے
کوئی بھی سوگوار ہو نہیں رہا

.....

سنائی جائے کوئی داستاں محبت کی
میں تھک چکا ہوں مجھے تازہ دم کیا جائے
فلک کو سونپ دیے جائیں یہ فلک زادے
زمیں کے بوجھ کو تھوڑا سا کم کیا جائے

میں پھول بانٹتا تسبیح کرتا رہتا ہوں
ازل سے میرا یہی ہے چلن خدا کا شکر
کسی یزید کے دربار سے نہیں نسبت
مری شناخت درِ پنجتن خدا کا شکر

.....

افسوس۔۔۔یہ بھی نیکی کمائی نہیں گئی
مجھ سے کسی کی جان بچائی نہیں گئی
دریا کے اس سوال کا میں کیا جواب دوں
کیوں مجھ سے کوئی ناو بنائی نہیں گئی

.....

یہاں غریب ہی کیوں بے گناہ مارا جائے
کوئی وزیر کوئی بادشاہ مارا جائے
میں جانتا ہوں یہاں عدل کرنے والوں کو
کسی کو کچھ بھی نہ ہو اور گواہ مارا جائے

.....

پناہ مانگتا ہوں بے پناہ ہونے سے
مجھے نہیں ہے غرض بادشاہ ہونے سے
خدا کا شکر ادا کر مری رعا کے طفیل
بچی ہوئی ہے یہ دنیا تباہ ہونے سے

.....

زندگی کی طرف بھی آوں گا
ابھی مصروفِ قتلِ عام ہوں میں
ہر طرف میری۔۔۔خامشی۔۔۔کا شور
ان کہا ان سنا کلام ہوں میں

.....

یہ جن میں کوئی ایک بھی لمحہ نہیں میرا
میں جانتا ہوں میرے مہہ وسال یہی ہیں

.....

میں شہر محبت بسانا چاہتا ہوں
سو آپ تھوڑی سی میری مدد کریں صاحب
سنا ہے دشت کو مسند نشین چاہیئے ہے
مجھے بھی اس کے لئے نامزد کریں صاحب
میں سر جھکائے کھڑا ہوں جہاں زمانوں سے
پتا کرو مری اپنی ہی بارگاہ نہ ہو
میں رفتگاں سے ہر اک پل کلام کرتا مکان
گرا نہ دیں کہیں دہشت زدہ مکین مجھے
کوئی کسی کا نہیں ہوگا تیر کھینچتے وقت
یہ سوچنا تھا دلوں میں لکیر کھینچتے وقت
جہاں قیام نہ کر پاؤں ایسا گھر نہ ملے
جہاں سے لوٹنا پڑ جائے ایسی راہ نہ ہو
مرے خیال میں اتنی بری نہیں دنیا
یہ ہر کوئی اسے جتنا برا سمجھتا ہے
بھٹکنے والے سے ہوتی ہے طے مسافتِ عشق
جو بے خبر ہے وہی راستہ سمجھتا ہے
زمیں پہ گر کے سنبھلنے کا فن بھی آتا تھا
میں روز ٹوٹ بھی جاتا تھا بن بھی جاتا تھا
یہ اور بات سمجھتا نہیں تھا کوئی شخص
میں آنے والے زمانوں کے دکھ سناتا تھا
یہ روشنی سے ہیں اتنے ڈرے ہوئے افراد
دیئے کی لو کو بھی آتش فشاں بتائیں گے
کسی کے ساتھ کوئی عمر بھر نہیں رہتا
یہ دکھ تو صرف تمہیں رفتگاں بتائیں گے

ناصر علی سیّد/ پشاور
(نذرِ غالب)

اَسرار موسموں کے سمجھنا مُحال ہے
یعنی خزاں نصیب طبیعت نڈھال ہے

ہم جانتے بُتوں کو ہیں اور ان کے فیض بھی
کیا پوچھیں برہمن سے کہ یہ کیسا سال ہے

پہلے تماشا بزم میں ہم کو بنا دیا
پھر سادگی سے پوچھتے ہیں کیسا حال ہے

ملبوسِ سبز میں اُسے دیکھا تھا خواب میں
اب تک نگاہ میں وہی رنگِ جمال ہے

بازار میں سہی وہ کبھی پوچھتے تو ہیں
کیا کم کہ ہم فقیروں کا اُن کو خیال ہے

کیا ہجر کے دنوں کی شکایت کوئی کرے
اَب وَصل میں بھی کب یہ طبیعت بحال ہے

تھا نَرم دھوپ کا جو سفر ختم ہوگیا
اَب ہم ہیں اور قریۂ رَنج و مَلال ہے

کب پہلی بار تھا پہ رقیبوں کے سامنے
نظریں جو پھیر لیں تو اُسی کا ملال ہے

خواب و سَراب و وَہم و گُماں کا شمار کیا
''عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے''

فسوں کار

پروفیسر قدرت اللہ شہزاد

اصنافِ نثر میں سفر نامہ اور خود نوشت مقبول ترین کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متذکرہ دونوں اصناف میں اُن لوگوں نے بھی طبع آزمائی کی جن کا تعلق براہِ راست ادب سے نہیں رہا۔ سیاسیات، سماجیات، دینیات، اقتصادیات، تجارت، سائنس و دیگر علوم وفنون سے وابستہ افراد نے آپ بیتیاں لکھیں اور سفر نامے رقم کیے۔ ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کا بظاہر ادب کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ عملی زندگی میں تعمیرات و تجارت کے شعبوں سے وابستگی رہی۔ مطالعہ ان کا شوق ہے۔ انہوں نے ''فرشتے کی ایف آئی آر'' کے نام سے خود نوشت لکھی تو ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ پھر یاد داشتوں، سفر ناموں اور مضامین کا مجموعہ ''مشرق کا موتی حوروں کا مسکن'' منظرِ عام پر آیا جس نے ان کی ادبی حیثیت کو مضبوط کر دیا۔ اب وہ ''قومِ قوسِ قزح'' کی صورت میں ثقہ بند سفر نامہ نگار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان کا سفر نامہ بہاول پور کے غیر افسانوی ادب میں اہم ترین اضافہ ہے۔

مبدائے فیاض نے ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کے باطن میں قصہ گوئی کی پرورش کی ہے جس کی نمود اُن کی کتب کی صورت ہمارے سامنے ہے۔ وہ خلوص کی گرمی سے آنکھوں کو نم ناک کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ اس کے مظاہر ہمیں سفری احوال میں کئی مقامات پر ملیں گے۔

ڈاکٹر ادریس کے مذہبی نظریات بہت واضح ہیں۔ وہ فرقہ پرستی سے سخت بیزار ہیں۔ سیرتِ طیبہ کو مذہبی عقائد پر ترجیح دیتے ہیں۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو عصبیت کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیتے۔ ختمِ نبوت کے شیدائی بلکہ پرچارک ہیں۔ جہاں احمدیت نظر آئی اضطراب کے عالم میں شعلہ جوالا بن جاتے ہیں۔ اس کا چھوٹا سا ثبوت وہ ردِ "Joss" نائیجیریا میں ڈاکٹر عبدالغفور غنی کے کلینک میں ڈاکٹر عبدالغنی کے کلینک میں مرزا غلام احمد کی تصویر و تحریر دیکھ کر رونما ہوا۔ سخت ناسازیِ طبع کے باوجود انہوں نے اس ڈاکٹر سے علاج کروانا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً وہاں سے لوٹ آئے۔ وہ مغربی بالخصوص افریقی ممالک میں احمدیت کا دامِ فریب بچھائے جانے پر سخت فکر مند ہیں۔ وہ علماء اور مغربی تحریکوں کے اغماض کو احمدیت کے پھیلاؤ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اپنی کتب میں احمدیت کے خلاف مبلغ کا کردار نبھاتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ادریس کی تینوں کتب میں یہ خوبی دیکھنے میں آئی کہ جہاں کوئی نامانوس اصطلاح مستعمل ہوئی تو قاری کی سہولت کے لیے فوراً وضاحت کر دی گئی۔ مثلاً اس کتاب میں Alpha Animal کی ترکیب آئی تو قوسین میں لکھ دیا (اکسانے والی)۔

اس سفر نامے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو قبائلی معاشرت سے گہری واقفیت حاصل ہے جس سے وہ اپنے قاری کو متعارف کرانا ضروری سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر ادریس جب یہ کہتے ہیں کہ ہر افریقی کو جنگلی پن کا دورہ ضرور پڑتا ہے تو وہ اس ضمن میں معلومات کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ادریس غیر ضروری تفصیل سے گریز کرتے ہیں۔ جہاں جہاں ایسے مقام آئے کہ جن کا تذکرہ ان کے پہلی کتاب ''فرشتے کی ایف آئی آر'' میں ہے تو وہ اعادہ کے بجائے قاری کو کتاب پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً لندن اور سعودی عرب کے اسفار کے ذکر میں مذکورہ کتاب پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

ڈاکٹر ادریس ہر صاحبِ ذوق کی طرح جمال پرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظریں پری وشوں کی متلاشی رہتی ہیں۔ فضائی میزبان ہوں یا کوئی اور، حسیناؤں سے ان کی دوستی جلد ہو جاتی ہے اور خوب نبھتی ہے۔ وہ جہاں بھی مہ جبینوں کا ذکر کرتے ہیں دل جمعی سے کرتے ہیں۔ اس ضمن میں تشبیہات و استعارات کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ حلیہ نگاری میں جزرسی سے کام نہیں لیتے بلکہ فیاضی برتتے ہیں۔ نائجیریا کے سفر میں کوئی بھی ایئر ہوسٹس ''چونکا دینے والی'' نظر نہیں آئی تو مایوس، بے چین اور ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ منزل پر پہنچ کر ہی سکھ کا سانس لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ ان کے زیادہ تر اسفار عہدِ شباب کے ہیں۔ وہ اپنی قوتِ پرواز پر بھروسہ کرتے ہوئے آسمانِ محبت میں بے ارادہ ''کسی'' کے دامِ ہم رنگ میں گرفتار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ قربتوں اور خلوتوں کے باوجود طہارتِ نفس کا خیال رکھتے بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر میں قوسِ قزح کے رنگوں اور لطیف جذبوں کو الفت کی خوشبو میں بھگو کر پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ادریس رجائیت پسند ہیں۔ کئی مقامات پر وہ قنوطیت کو شگفتگی میں بدلتے دکھائی دیتے ہیں۔ دیارِ غیر میں رہ کر اپنی جنم بھومی سے محبت ان کی تحریر سے پھوٹ پھوٹ پڑتی ہے۔ وہ سماج کے منفی رویوں سے شاکی ہیں اور ان کے خلاف بلند آہنگ ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی نثر میں جینے کا ڈھنگ، انا کے تحفظ کا سلیقہ، خود اعتمادی اور بلند حوصلگی کے عناصر غالب ہیں۔ فنی چابک دستی، تخلیقی ثروت مندی اور احساس کی ندرت نے ان کے سفر نامہ کو پر کشش بنا دیا ہے اور سلیقہ اظہار نے وقار، نکھار اور اعتبار بخشا ہے۔

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی اثر آفریں نثر احساس و جذبے کی لطافت کے ساتھ ساتھ اظہار کی نئی جہت اور فکری بالیدگی سے مالا مال ہے۔ وہ معاشرتی اقدار و روایات کا بھرپور ادراک رکھتے ہیں۔ وہ جہاں بھی فطرت کی رعنائیاں اور دل فریبیاں دیکھتے ہیں، مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کا عمیق مشاہدہ تخلیقی جوہر بن کر قوتِ اظہار میں جاذبیت و فسوں کاری کی شان پیدا کر دیتا ہے جو انہیں ادبی دنیا کی صفِ اول میں لا کھڑا کرتا ہے۔

انتظار حسین- اُردو ادب کی نامور شخصیت

نوید مرزا

انتظار حسین اُردو ادب کی نامور شخصیت کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، تنقید نگار اور کالم نگار کے طور پر شناخت رکھتے ہیں۔ اُردو کے افسانوی ادب میں وہ اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی تحریروں میں علامتی اور استعاراتی انداز کو اختیار کیا اور اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے دنیائے ادب میں عزت و شہرت حاصل کی۔

انتظار حسین 7 دسمبر 1925ء کو ڈبائی ضلع بلند شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور تشریف لائے اور جامعہ پنجاب سے ایم اے اردو کیا اور شعبۂ صحافت سے وابستہ ہوئے۔ اُنہوں نے جامع پنجاب سے ایم اے اردو کیا۔ انتظار حسین کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گلی کوچے'' 1953ء میں شائع ہوا۔ اُن کی دو کتابوں ''بستی'' اور ''خالی پنجرہ'' کا فارسی زبان میں بھی ترجمہ ہوا، جو سمیرا گیلانی نے کیا تھا۔ انتظار حسین کے کالم ایک طویل عرصہ تک روزنامہ ''مشرق'' میں ''لاہور نامہ'' کے عنوان سے شائع ہوتے رہے بعد ازاں انہوں نے روزنامہ ''جنگ'' میں کالم لکھے۔ اُنہوں نے انگریزی زبان میں بھی کالم لکھے اُن کی دیگر کتابوں میں ناول ''آگے سمندر، بستی، چاند گہن اور ناولٹ ''دن'' شامل ہیں جب کہ افسانوی مجموعوں میں آخری آدمی، خالی پنجرہ، خیمے سے دور، شہرِ افسوس، کچھوے، کنکرے اور گلی کوچے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ بیتی ''چراغوں کا دھواں'' اور ''دلی تھا جس کا نام، جل گرجے (داستان) اور تنقیدی کتاب ''نظریے سے آگے'' بھی شائع ہوئیں۔ انتظار حسین کے لکھے ہوئے ڈرامے پی ٹی وی سے نشر ہوتے رہے اور بعد ازاں کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ڈراموں کی ان کتابوں میں ''خوابوں کے مسافر''، ''درد کی دوا کیا ہے'' ''نفرت کے پردے میں'' اور ''پانی کے قیدی'' شامل ہیں۔ انتظار حسین کو اُن کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراض میں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا اُنہیں حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز اور اکادمی ادبیات کی طرف سے کمالِ فن ایوارڈ بھی عطا ہوا تھا۔ وہ پاکستان کے پہلے ادیب تھے جن کا نام مین بکر پرائز کے لیے ادیبوں کی فہرست میں شامل ہوا تھا۔ حکومت فرانس کی طرف سے بھی اُنہیں افیسر آف آرڈر آف آرٹس کا اعزاز ملا۔

انتظار حسین بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے اُنہوں نے ناول، افسانہ، تنقید اور کالم نگاری میں یکساں طور پر خود کو منوایا وہ جب تک زندہ رہے ادب سے جڑے رہے۔ پاک ٹی ہاؤس میں اپنی مخصوص نشت میں اُن کی موجودگی بہت سے لوگوں کے لیے باعث مُسرت اور ایک اعزاز ہوتا تھا۔ اُنہیں اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو سحر میں جکڑ لینے کا فن آتا تھا وہ عام قاری کے لیے قدرے مشکل پسند ادیب تھے تاہم ادب کا سنجیدہ قاری اُن کے فن کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا تھا اُن کے افسانوں کو داستانوی ادب کی بہترین مثال کے سمجھا جاتا تھا۔ بقول ذوالفقار احسن، ''داستانوی ادب کے ایک آخری افسانہ نگار انتظار حسین تھے جنہوں نے قدیم داستانوی ادب کو اپنے افسانوں میں زندہ رکھا، وہ قدیم داستانوی ادب کے ایسے پاس دار تھے جنہوں نے اساطیر کو متروک نہیں ہونے دیا۔ زمانۂ جدید میں اُنہوں نے اس روایت کو کسی نہ کسی طور اپنائے رکھا۔ وہ بڑے پختہ کار اور تجربہ کار افسانہ نگار تھے۔ کہانیاں اُن کے اندر سے پھُوٹتی تھیں اُن کی لکھی ہوئی کہانیاں قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں۔''

انتظار حسین جب تک زندہ رہے، شہرِ لاہور میں مرکز توجہ رہے لوگ اُن سے مل کر فخر محسوس کرتے تھے۔ 2 فروری 2016ء کو جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازے میں پورا شہر اُمڈ آیا۔ اُنہوں نے طویل عمر پائی 91 برس کی عمر پانے والی اس عظیم شخصیت نے تمام عمر بڑے وقار کے ساتھ گذاری اور علمی ادبی حوالوں سے دُنیائے ادب کی بڑی بڑی شخصیات سے اُن کی ملاقاتیں رہیں۔ انتظار حسین کی تخلیقات بڑے بڑے اداروں سے شائع ہوئیں اور اُن کی تحریریں آج بھی ادب کے طالب علموں میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں وہ عام قاری کی سمجھ میں آنے والے ادیب نہیں تھے بلکہ ایک مخصوص طبقہ ہی اُن کی لکھی ہوئی تحریروں سے فیض یاب ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ بقول عقیل حسین جعفری، ''انتظار حسین اُردو افسانے کا ایک معتبر نام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب، بدلتے لہجوں اور کرافٹنگ کے باعث آج بھی پیش منظر کے افسانہ نگاروں کے لیے بڑا چیلنج ہے۔ اُن کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اُنہوں نے داستانوی فضا۔ اس کی کردار نگاری اور اسلوب کا اپنے عصری تقاضوں کے تحت برتا ہے، اُن کی تحریروں کی فضا ماضی کی داستانوں کی بازگشت ہے۔''

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ انتظار حسین اپنی طرز کے ایک منفرد اور غیر معمولی ادیب تھے، جن کی تحریروں میں چھپی معنویت تک پہنچنے کے لیے ذہنی جست لگانی پڑتی ہے بقول گوپی چند نارنگ، ''انتظار حسین کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کے اُنہوں نے افسانے کی مغربی ہیئت کو جُوں کا توں قبول نہیں کیا۔ بلکہ کتھا کہانی اور داستان وحکایت کے جو مقامی سانچے مشرقی خراج عامہ اور افتادِ ذہنی صدیوں کے عمل کا نتیجہ تھے اور مغربی اثرات کی یورش نے جنہیں رد کر دیا تھا۔ انتظار حسین نے اُن کی دانش وحکمت کے جوہر کو گرفت میں لے لیا اور اُن کی مدد سے مروج سانچوں کی تقلیب کر کے افسانے کو ایک نئی شکل اور نیا ذائقہ دیا۔'' اللہ پاک انتظار حسین صاحب کی مغفرت فرمائیں۔ (آمین)

اکیسویں صدی کی نثری نظم اور ڈاکٹر وحید الدین خاں

ڈاکٹر ساحل سلہری

نظم، نظم ہوتی ہے اور نثر، نثر ہوتی ہے لیکن جب کسی نثر پارے میں شعری آہنگ اتنے گہرے رچاؤ سے آئے کہ اس پر نثر کا گماں نہ گزرے تو وہ فن پارہ نثری نظم کے زمرے میں آتا ہے۔ جب غیر مقفیٰ اور بحر کے ارکان کو بھی توڑ کر نظم نگاری کی روایت مقبولیت پا سکتی ہے تو غیر عروضی نظم نگاری کی گنجائش بھی بنتی ہے۔ بلحاظ صنف و ہیئت تذکرہ ہو تو نظم کو پابند، معرا، آزاد اور نثری خانوں میں بانٹنا اور بات ہے۔ جب دیگر ہیئتوں میں ہم اپنی تحریروں میں لفظ ''نظم'' لکھتے ہوئے ہر بار پابند، معرا اور آزاد لکھنا لازم نہیں سمجھتے تو پھر غیر عروضی (نثری) نظم کے ساتھ ہر بار لفظ ''نثری'' کا سابقہ لگانا کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے۔؟ بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں غیر عروضی نظم اپنی تمام تر خوب صورتی کے باوجود مقبول نہ ہو سکی اس کی وجہ شاید اس صنف کے ساتھ ہر بار لفظ ''نثری'' لکھنا ہے۔۔۔۔۔۔۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں ایک بار پھر نظم نگاروں نے اس ہیئت کو مضبوط و مقبول کرنے کا آغاز نئے اسالیب سے کیا۔ رواں صدی میں نثری ہیئت کی نظم کو اس وقت اعتبار و وقار زیادہ ملا جب جدید اُردو غزل کے نمایندہ شاعر ڈاکٹر جواز جعفری نے اس ہیئت میں شاعری کی۔ جواز جعفری کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے اب تک کسی اور ہیئت میں نظم نگاری نہیں کی۔ گذشتہ چند برسوں میں شاعری کی یہ ہیئت اتنی مقبول ہو چکی ہے کہ متعدد معاصر شعرا نے غیر عروضی نظم نگاری میں خاصی دلچسپی ظاہر کی ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے اب تک نثری نظم کے متعدد مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں اور ادبی رسائل میں اس ہیئت کی نظمیں مسلسل شایع ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں بات کریں تو جواز جعفری کی نثری نظموں کے مجموعے ''موت کا ہاتھ کلائی پر ہے'' ۲۰۰۵ء، ''عمرِ رواں سے پرے'' ۲۰۱۴ء، ''وصل سے خالی دن'' ۲۰۱۸ء اور ''متبادل دنیا کا خواب'' ۲۰۱۸ء فکشن ہاؤس لاہور سے شایع ہو چکے ہیں۔ اسلم طارق کا شعری مجموعہ ''سورج کا رستہ'' ۲۰۰۵ء میں روش پبلی کیشنز لاہور سے شایع ہوا۔ پروفیسر عائشہ اختر کا شعری مجموعہ ''احساس کے آبگینے'' ۲۰۰۶ء میں دارالادب، لاہور نے شایع کیا۔ ۲۰۱۲ء میں شہزاد کراچی سے سید کاشف رضا کا شعری مجموعہ ''ممنوع موسموں کی کتاب'' شایع ہوا۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نثری نظم کو وہ مقبولیت ملی کہ ممتاز غزل گو، افسانہ نگار اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے ادیبوں نے نظم نگاری شروع کر دی۔ اس ضمن میں حسن عباسی کی طویل نثری نظم ''محبت سے کون ڈرتا ہے؟'' اہمیّت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر صائمہ ارم جیسی مقبول افسانہ نگار نے بھی نثری نظمیں کہنا شروع کر دی ہیں۔ ان کی نظم ''امید'' لطیف جذبات و احساسات کی حامل ہے۔ نثری ہیئت میں نظم گوئی کرنے والے معاصر شعرا میں ڈاکٹر وحید الرحمٰن خاں کا نام اختیار کرنے لگا ہے۔ وہ ایک اہم اقبال شناس بھی ہیں اور ان کی اردو سفر ناموں پر تحقیقی و تنقیدی کتاب ''نقدِ سفر'' بک ہوم لاہور سے ۲۰۱۴ء میں شایع ہوئی۔ وحید الرحمٰن خاں اپنی نظموں میں عصری صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں تہذیب، معاشرت اور زندگی سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ان کی حال ہی میں لکھی گئی نظمیں اپنے موضوع اور اسلوب پر اعتبار سے خوب صورت ہیں۔ ان کی کوہ پیما محمد علی سد پارہ کے لیے لکھی نظم ملاحظہ کیجیے:

پہاڑ
مجرم کی طرح
سرنگوں کھڑا ہے
پتھروں کے قلب
جاری ہو گئے ہیں
گلیشیئر
اب گلیشیئر نہیں رہے
تمھاری یاد میں
فطرت کا اشک منجمد ہے
یہ اشک
برف کا مرقد ہے
اب یہاں
کوہ پیما نہیں آئیں گے
تربت برف پر
پھول چڑھانے
زائرین آئیں گے
تمھارا قد
پہاڑ سے بلند ہو گیا ہے

(۲)

فطرت ایک سنگ دل محبوبہ ہے
جو
سہل طلب عاشقوں کو

دیدار سے محروم رکھتی ہے
صرف بہادروں سے ہم کلام ہوتی ہے

جانبازوں پر
مہربان ہوتی ہے
تسخیر کے خواب
دیکھنے والی آنکھوں
اور معصوم ارادوں کی
قدردان ہوتی ہے
فطرت
تمھارے انجام سے
باخبر تھی
ہزاروں سال پہلے
اس نے
تمھاری یاد میں
تمھارے انتظار میں
برف کا تاج محل بنایا تھا
تم محبُوب فطرت ہو

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خاں عصری حسیّت کے حامل نظم نگار ہیں۔ وہ اپنے گردوپیش کے واقعات، مناظر، ماحول اور حالات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں سماج، زندگی اور انسان سے جڑت کا احساس دلاتی ہیں۔ وہ جذبات، احساسات، مشاہدات اور دل میں درد رکھنے والے نظم نگار ہیں۔ انھوں نے گذشتہ دنوں پہاڑوں کو سر کرتے ہوئے لاپتہ ہونے والے بہادر سپوت محمد علی سد پارہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اس پہاڑی سلسلے کی عمدہ منظر کشی کی ہے جس میں محمد علی سد پارہ مدفون ہیں۔ انھوں نے اس سانحہ کے بعد پہاڑ کو سرنگوں دکھایا ہے جو ندامت کے باعث ایک مجرم کی طرح جھکا ہوا ہے اور گلیشیئر کے جاری ہونے کو پتھروں کے بہتے اشکوں کا روپ دیا ہے۔ ڈاکٹر وحید الرحمٰن خاں نے کوہ پیما محمد علی سد پارہ کو بہادر، جانباز، صاحب تسخیر اور محبُوب فطرت قرار دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ علی سد پارہ نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ اس کے بعد آنے والے کوہ پیما اب پہاڑوں کو سر کرنے نہیں یقیناً زائرین کی طرح اس کی تربت پر پھول چڑھانے آئیں گے۔

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خاں نے لفظ ''تاج محل'' کو نئے انداز میں استعمال کیا ہے۔ ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارہ لے کر اپنی محبُوبہ کے لیے تاج محل بنایا تھا۔ وہاں شہنشاہ عاشق تھا اس نے اپنی محبُوبہ کے لیے تاج محل تعمیر کرایا تھا اور یہاں فطرت محبُوبہ ہے جس نے اپنے عاشق (محمد علی سد پارہ) کے لیے پہاڑوں کے دامن میں برف کا تاج محل بنایا ہے۔ شاعر نے محمد علی سد پارہ کو محبُوب فطرت قرار دیا ہے۔ فطرت کو اس عظیم کوہ پیما کا انتظار تھا اس نے ہزاروں سال پہلے ہی اس کی یاد اور انتظار میں برف کا حسین تاج محل بنایا دیا تھا۔ ڈاکٹر وحید الرحمٰن خاں نے اپنی نظموں میں نہ صرف محمد علی سد پارہ کو حرفِ تہنیت پیش کیا ہے بل کہ ان تمام آنکھوں کو بھی حرفِ تہنیت کی سزاوار قرار دیا ہے جو تسخیر کا خواب دیکھتی ہیں اور دنیا کے تمام جانباز اور بہادر جوانوں کو تحسینی کلمات سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر وحید الرحمٰن خاں کی یہ نظمیں شعریت سے مملو ہیں اور میں قیاس کرتا ہوں کہ وہ آنے والے دنوں میں بے پناہ امکانات کے حامل نظم نگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں دعا گو ہوں، اس نظم نگار کے لیے۔۔۔

عامر بن علی/ جاپان

جب نہیں کوئی ہم سفر جوگی
جو ہے من میں ترے تو کر جوگی
غمِ اُلفت ہے لاعلاج اگر
کیا کریں گے یہ چارہ گر جوگی
ہیر تنہا ہے جھنگ بیلے میں
رانجھا روگی بنا ادھر جوگی
آنکھ دجلہ بنی بدن شعلہ
کس نے پوچھا ہے تیرا گھر جوگی
یوں تو زندہ رہے بچھڑ کے بھی
دلِ وحشی ہوا مگر جوگی
جب اُٹھے تیرے آستانے سے
تب سے پھرتے ہیں دربدر جوگی
عاشقی کا ہے حق یہی عامر
عشق جائے جو جائے سر جوگی

اک اور ہجرت

کتنا خالی تھا میرا کمرہ
یہ یاد ہے
جب پچھلی ہجرت کے بعد
ہم اس مکاں میں آئے
تو کتنا خالی تھا میرا کمرہ
بہت سی یادوں، کئی کتابوں
پرانے کپڑوں کیلنڈروں سے
مرا یہ کمرہ جو بھر چلا تھا
تو لگ رہا ہے
کہ اب تو اس کو بھی چھوڑ جانے میں کچھ ہی دن ہیں
کسی نئے شہر کی طرف جانے والے
رستے بلا رہے ہیں
چلو کہ اب وقت آ گیا ہے
اب اگلی ہجرت میں چند دن ہیں
تو یہ مکاں مجھ کو گھر لگا ہے

چل دیے تم کہاں

لبنیٰ صفدر/ لاہور

زندگی کس قدر مختصر ہے بالکل ایک پھول کی مانند جو کھلا اپنے رنگ اور بہار سے چمن کی رونق کو دوبالا کیا اور مرجھا گیا لیکن ہم میں سے بہت سے اپنی مہکار اس طرح بکھیر جاتے ہیں کہ تا دیر چمن میں اُس کی باس باقی رہتی ہے جبکہ کچھ بن کھلے مرجھا گئے یا اس طرح سے کھلے کہ نہ چمن میں اُن کا وجود کسی کو پتہ چلا نہ بہار کی ہوا اُن کی مہک سے معطر ہو سکی۔ کامیاب لوگ وہی ہیں جنہوں نے اپنا ہر دن کامیاب گزارا اور کوئی دن تو کیا کوئی لمحہ بھی بیکار جانے نہیں دیا۔ ان دنوں دو دنوں میں دو عظیم خواتین کی وفات نے افسردہ سا کردیا۔ دونوں ہی جدوجہد اور کامیابی کی اعلیٰ داستانیں رقم کرگئیں۔ میں پہلے اپنی لیجنڈ لکھاری محترمہ بشریٰ رحمن صاحبہ کے بارے میں لکھنا چاہوں گی۔ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص نے اُن کی تحاریر سے فیض پایا ہے۔ اُردو سے جان پہچان رکھنے والوں میں سے اکثریت نے اُن کی تحریروں سے زبان دانی سے واقفیت حاصل کی۔ میں سکول میں پڑھتی تھی جب پہلی بار پہلا ناول ''پیاسی'' پڑھا۔ اگر چہ اس پر ایک ڈرامہ نشر ہوا لیکن مجھے ناول پڑھنے کا زیادہ مزہ آیا۔ نثر نگاری اور ناول نگاری میں بشریٰ رحمن ہمیشہ میری پسندیدہ رہیں اور میں ہمیشہ ان سے ملنے کے بارے میں سوچا کرتی۔ آخر اپنے شوہر کے توسط سے اُن کے گھر اور اُن کے آفس میں کئی بار اُن سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا۔ بشریٰ رحمن نستعلیق شخصیت کی مالک تھیں۔ جو بات ان کی تحاریر میں نظر آتی ہے وہی رکھ رکھاؤ، محبت، انا اور دانش اُن کی شخصیت میں بھی نمایاں تھیں کسی نے سچ کہا ہے کہ کسی عالم کے پاس کچھ دیر بیٹھنا سینکڑوں ہزاروں کتب پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے۔ میں جتنی دیر اُن کے پاس بیٹھتی ہر بات ہر جملے سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملا۔ ہر بات پر دلیل اور باوزن کرتیں۔ پہلی ملاقات سے کچھ عرصہ قبل ان کے شوہر کی وفات ہوئی تھی۔ ہماری پہلی ملاقات ان سے ان کے گھر پر ہوئی۔ عالیشان گھر کے بہت بڑے ڈرائنگ روم کو نہایت نفاست سے سجایا گیا تھا۔ اشیاء کا چناؤ اور ترتیب اُن کے اعلیٰ ترین ذوق کا نمونہ تھی۔ یہیں ان کی بہت بڑی تصویر بھی آویزاں تھی کچھ دیر بعد میرے اور میرے شوہر کے لئے اشیائے خورد و نوش سے بھری ہوئی ٹرالی آئی۔ پاس بیٹھیں اور مسلسل ہر چیز کھانے پر اصرار کرتی رہیں۔ مجھے کہتی رہیں کہ تم پلیٹوں میں سب چیزیں ڈال کر سرو کرو۔ ہر چیز اُنہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہوئی تھی۔ جس میں کباب، گاجر کا حلوہ، مٹھائیاں اور دیگر کئی اشیاء شامل تھیں۔ دبنگ لہجہ اور مضبوط کردار کی عورت کا دل انتہائی نرم اور مہربان تھا۔ اپنے شوہر کی باتیں دیر تک سناتی رہیں اور روتی رہیں۔ میں بھی اپنے آنسو نہ روک سکی اور ان کا ہاتھ تھام کر دیر تک اُن کی باتیں سنیں۔ ان کا درد مجھے محسوس ہو رہا تھا وہ اپنے شوہر اور بچوں سے محبت کرنے والی بیوی اور ماں تھیں۔ کہنے لگیں جب بچے چھوٹے تھے تو میں اُنہیں گود میں لے کر دوسرے ہاتھ سے کھالیا کرتی۔ ادب سے محبت کا یہ عالم تھا کہ آخری دنوں میں بھی سیرت طیبہ لکھ رہی تھیں اور کیسی خوش بختی اور نیک بختی کا مقام ہے کہ اپنے کام کو پایہ تکمیل تک بھی پہنچایا۔ بشریٰ رحمن نے بطور ممبر آف نیشنل اسمبلی بھی اپنی ذمہ داریاں نہایت دیانتداری سے نبھائیں۔ بتاتی رہیں کہ کئی بل انہوں نے منظور کروائے، کئی بار فون پر بات ہوئی تو کہہ رہی تھیں کہ کورونا کی وجہ سے اب کہیں آتی جاتی نہیں ہوں۔ طبیعت بھی خراب رہتی ہے۔ بہت سی یادیں ہیں۔ ہلکا پھلکا مذاق بھی کرتی رہیں۔ ابھی بھی ان کی باتیں کانوں میں گونجتی ہیں۔ 29 اگست 1944ء کو پیدا ہوئیں۔ 2008 سے 2013 تک نیشنل اسمبلی کی ممبر رہیں۔ وومن کوٹہ میں 2002 سے 2007 تک رہیں۔ 1985ء تا 1990ء تک پنجاب اسمبلی کی رکن رہیں۔ آپ نے ستارہ امتیاز حاصل کیا۔ چارہ گر، بہشت، کس موڑ پر ملے ہو۔ لگن، راہ راست، بت شکن، چاند سے نہ کہو، چپ، اک آوارہ کی خاطر، پیاسی اور بے شمار دیگر مشہور زمانہ کتب کی مصنفہ تھیں۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ میں نے بہت شوق سے پہلا ناول "پیاسی" پڑھا تو بہت خوش ہوئیں۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ بشریٰ رحمن کا قلم اُداس اور چپ ہو گیا ہمیشہ کے لئے جبکہ برصغیر کی نامور گلوکارہ لتا منگیشکر کی وفات پر دل اداس ہو گیا کچھ لوگ دلوں میں اتنی محبت اور جگہ بنا لیتے ہیں کہ مذہب اور سرحدوں کی قید بھی ان کا راستہ نہیں روک پاتی۔ ہندوستان میں گونجنے والی اس سریلی آواز کا جادو دنیا بھر میں جاگا۔ تقریباً 70-80 سال تک ہر نسل کو متاثر کرنے والی یہ واحد مسحور کن آواز تھی۔ جو ہر ایک کی پسندیدہ تھی۔ 50 ہزار سے زائد نغموں کو گانے والی اس خوبصورت ترین آواز کی مالکہ کا جب میں نے ایک انٹرویو دیکھا جس میں وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر مجھے اگلا جنم ملا تو میں لتا منگیشکر کبھی نہیں بنوں گی۔ آپ نہیں جانتے لتا منگیشکر نے کتنے دکھ سہے ہیں۔ لیکن دُنیائے موسیقی میں ہمیشہ اُن کا نام اور مقام یقیناً کوئی دوسرا نہ پا سکے گا۔

اے دل نادان، لگ جا گلے، تیرے لئے، تیرے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں، میرے نصیب میں، ستم شوم سندرم، آپ کی نظروں نے سمجھا، چلتے چلتے یونہی کوئی مل گیا تھا۔ ہم تھے جن کے سہارے جیسے بے شمار نغموں کی گونج آج بھی ہر دل کی دھڑکن میں گونجتی اور ہر کان میں رس گھولتی ہے۔ لتا 28 ستمبر 1929ء کو اندور میں پیدا ہوئیں اور 6 فروری 2022 کو دار فانی سے کوچ کرگئیں۔ انہیں Queen of Melody, Voice of Melinium, Nightingale of India کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، لتا نے نیشنل فلم ایوارڈ حاصل کیا۔ بے شمار دیگر ایوارڈز کی ایک لمبی لسٹ ہے۔ لتا نے 13 سال کی عمر میں اپنے کیرئیر کا آغاز کردیا تھا اور شروع میں ہی ان کے گانے مشہور ہوگئے۔ یہ بلبل بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی، چمن اداس ہے۔

سات رنگوں کا شاعر.....فراست رضوی

شاعر علی شاعر/لاہور

جناب فراست رضوی کے سات مجموعہ ہائے کلام میرے مطالعے کی میز پر موجود ہیں جن کے موضوع اور نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کُہر میں ڈوبی شام (ہائیکو) ۲۰۰۱ء
۲۔ کتابِ رفتہ (غزل) ۲۰۰۷ء
۳۔ درد کی قندیل (رُباعیات) ۲۰۱۴ء
۴۔ آیاتِ محبت (عقیدت نگاری) ۲۰۱۸ء
۵۔ سلام فلسطین (مزاحمتی نظمیں) ۲۰۱۹ء
۶۔ زمستان کا چاند (رباعیات) ۲۰۲۰ء
۷۔ چراغِ شکستہ (غزل) ۲۰۲۱ء (غیر مطبوعہ)

اِن تصانیف سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ اُن کی جہتیں مختلف ہیں جن میں ہائیکو، رُباعی، نظم اور غزل گوئی کے ساتھ ساتھ عقیدت نگاری بھی شامل ہیں۔ شاعری تو اُن کا ہنر ہے اور اُن کا فن تنقید نگاری ہے۔ یہ فن و ہنر قدرت نے اُنھیں ودیعت کیے ہیں۔ وہ تائیدِ ایزدی ہی سے غزل و نظم اور نثر کے گلستان میں مختلف ساخت و تراش اور رنگ و نکہت کے گل ہائے رنگ رنگ کھلاتے ہیں جن کی خوش بو قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فنِ شاعری اور مشاہیرِ اُردو ادب کے اذہان و قلوب کو تادیر معطر رکھتی ہے اور اُن کی تحریروں سے کسبِ فیض کرنے والوں کے قلوب اپنے اندر فہم و فراست، علم و دانش اور عقل و خرد کا اُجالا محسوس کرتے ہیں جن کی روشنی اُنھیں ایک عالم میں جگمگاتی رہتی ہے۔

میں نے اُن کی شاعری کا بڑا عمیق مشاہدہ اور بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اُن میں ایک پختہ و تازہ کار کہنہ مشق شاعر نظر آیا ہے۔ اِن ساتوں کتابوں کی اشاعت کے بعد بھی میری نظر سے آج تک کوئی مضمون یا تحریر ایسی نہیں گزری جس میں جناب فراست رضوی کے کلام کے معائب کی نشان دہی کی گئی ہو، اُن کے کلام میں معائبِ سخن تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملتے، مگر محاسنِ سخن جابہ جا نظر آتے ہیں۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شاعر و نقاد ہیں جن کے وسیع مطالعے، حافظے اور ژرف نگاہی کی گواہی اُن کے مخالفین بھی دیتے ہیں۔ اُن میں ناقدانہ شعور پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے جن سے وہ کسی بھی ہم عصر شاعر کے کلام کو فوراً جانچ لیتے ہیں کہ اُس میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا خامیاں ہیں۔ وہ ایک زیرک اور طبّاع شاعر ہیں۔ متقدمین، متوسطین اور متاخرین سے لے کر آج تک کے تمام شعرا کا کلام اُن کی نظر سے گزرا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ دنیائے اُردو ادب میں کس شاعر کا کیا مقام ہے۔ وہ ایسے شعرا سے بھی واقف ہیں جن کے کلام کی کوئی حیثیت نہیں، مگر لابی، گروپنگ اور سرکاری عہدوں کی بے ساکھیوں اور پروپیگنڈہ نے اُنھیں بڑا شاعر بنا رکھا ہے۔ وہ ایسے شعرا سے بھی شناسا ہیں جو واقعی عبقری ہیں اور ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آئے ہیں، مگر تعصب اور غربت یا اُن کی کوئی لابی، گروپ اور پروپیگنڈہ نہ ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں، مگر اُن کا کلام آفاقی نوعیت کا ہے اور وہ بڑے مضبوط، کہنہ مشق اور پختہ کار و جدید شاعر ہیں۔

جناب فراست رضوی کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُنھیں یہ ادراک ہے کہ کیا نہیں لکھنا، کیا لکھنا ہے اِس نقطے سے تو ہر شاعر واقف ہوتا ہے، مگر اہم شاعر وہ ہے جسے یہ درک ہو کہ کیا نہیں لکھنا۔ میں نے ایسے ناقدین کی مٹی پلید ہوتے دیکھی ہے جو بلا سوچے سمجھے، مالی منفعت یا کسی اور لالچ میں اُن شخصیات پر بھی لکھ دیتے ہیں جن پر نہیں لکھنا چاہیے۔ فراست رضوی کو اِس ایک اہم نقطے نے بڑا اور اہم شاعر و نقاد بنا دیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ساتوں مجموعہ ہوئے کلام کا فرداً فرداً اجمالی مطالعے کا عرق پیش کیا جائے تاکہ اُن کی تمام جہتوں کے محاسن اور فنون اُبھر کے قارئین و ناقدین اور مشاہیر کے سامنے آسکیں۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ کُہر میں ڈوبی شام

جناب فراست رضوی کی پہلی کتاب ''کُہر میں ڈوبی شام'' ہائیکو نظموں کا مجموعہ ہے جسے اکادمی بازیافت، کراچی نے نومبر ۲۰۰۱ء میں شایع کیا ہے جس کے صفحات ۱۸۴ اور قیمت ۱۵۰/روپے ہے۔ اِس کتاب پر اظہارِ خیال قلم بند کرنے والوں میں راغب مرادآبادی، محسن بھوپالی، ڈاکٹر محمد امین، ڈاکٹر فہیم اعظمی، ڈاکٹر یونس حسنی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، دل نواز دل اور آصف ثاقب صاحبان شامل ہیں۔

ہائیکو جاپانی ادب سے اُردو ادب میں در آئی ہے اور اب ایسا لگتا ہے کہ یہ اُردو ادب ہی کی صنف ہے کیوں کہ یہ ہماری تہذیب و ثقافت سے آہنگ اور شاعری کے مزاج میں جذب ہوگئی ہے۔ ہائیکو میں شروع سے کئی ہیئتی تجربات ہوئے، مگر پھر اِسے مقبولِ عام اور شہرتِ دوام دینے کے لیے ایک وزن پر مخصوص کر دیا گیا۔ اِس کے بعد ہائیکو (۵+۷+۵):

فعلن فعلن فاع
فعلن فعلن فعلن فاع
فعلن فعلن فاع

پر لکھے جانے لگے اور آج تک یہی طریق رائج ہے اور اِسے ہی معتبر و مستند مانا جاتا ہے۔ اگر اِس ضمن میں ڈاکٹر محمد امین اور اُسی زمانے کے دیگر ہائیکو نگاروں کے ہائیکو ملاحظہ کرتے ہیں تو وہ کہیں سے بھی ہائیکو نظر نہیں آتے۔ یہ پاکستان میں اُردو ہائیکو کا ابتدائی زمانہ تھا۔ مختلف شعرا نے مختلف اوزان اور بحور میں ہائیکو لکھے یہاں تک پروفیسر ڈاکٹر مقصود حسنی (قصور) نے نثری ہائیکو بھی لکھے گئے، مگر کوئی بھی طریق اپنے دیرپا نقوش ثبت نہ کر سکا، مگر جب اُردو ہائیکو کا ایک طریق کار واضح کر دیا گیا تو اِس پر دن

دوگنی اور رات چوگنی کام ہونے لگا۔ افکار و خیالات کو نت نئے انداز و اُسلوب اظہار کا جامہ زیب تن کرایا جانے لگا۔ فی زمانہ بہاریہ ہائیکو کے ساتھ ساتھ حمدیہ و نعتیہ و منقبتی ہائیکو نہ صرف لکھے جا رہے ہیں بلکہ اُن کے علاحدہ علاحدہ اصنافِ سخن میں مجموعہ ہائے کلام بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

جناب فراست رضوی کا یہ مجموعۂ ہائیکو ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں تمام ہائیکو اِسی ہیئت میں تخلیق کیے گئے ہیں جو ہیئت متشکل ہو چکی ہے اور اُنھی اوزان میں ہیں جو متعین کر دیے گئے ہیں۔ کچھ شعرا نے اِنھی اوازن میں غیر مقفیٰ ہائیکو بھی لکھے ہیں، مگر شاعرِ موصوف کے تمام ہائیکو مقفیٰ ہیں جو میری نظر میں ہائیکو کی مستحسن شکل ہے۔

چند ہائیکو پیشِ خدمت ہیں:

کُہر میں ڈوبی شام
ایسے میں ملنے آیا
مجھ سے ماہِ تمام

☆

منظر پڑ گئے ماند
کالی رات ڈراتی ہے
کب نکلے گا چاند

☆

شرمندہ ہیں یار
ہم سے ٹوٹ نہیں پائی
خواہش کی دیوار

☆

تجھ بن فصلِ بہار
خنجر سی دل میں اُتری
چیری کی مہکار

☆

سرما کی اِک شام
یاد دِلاتی ہے کتنے
بھولے بسرے نام

جناب فراست رضوی کے ہائیکو کس معیار کے ہیں آیے مشاہیر کی آرا سے اقتباسات ملاحظہ کرتے ہیں:

''فراست کی گرفت زبان، بیان اور فن پر مضبوط ہے۔ اُنھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، حتیٰ کہ رُباعی جیسی مشکل صنفِ شاعری میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ مجھے کامل اُمید ہے کہ اُن کا ہر مجموعہ قبولِ عام کی سند حاصل کرے گا۔ آخر میں یہ ضرور کہوں گا کہ فراست کا تقاضا بھی ہے کہ غزل، رُباعی، قطعہ اور نظم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی جائے۔

اپنی زباں میں سب کچھ ہے پیارے''

(راغب مرادآبادی)

☆.....☆.....☆

''فراست رضوی ذہین اور پڑھے لکھے آدمی ہیں، اُن کی ذہانت و فراست اُن کی تحریروں سے بھی عیاں ہوتی ہے اور گفتگو سے بھی۔ شعر گوئی میں بھی اُن کے یہاں مشاہدے کی باریکی اور مطالعے کی وسعت اپنا رنگ دِکھاتی ہے۔

اِدھر اُنھوں نے ہائیکو پر بھی توجہ دی ہے۔ ہائیکو بہ ظاہر ایک آسان اور سادہ سی صنفِ سخن نظر آتی ہے مگر اِس کا اختصار، جامعیت، ایمائیت اور اِس کی دیگر پابندیاں اِسے ایک مشکل صنفِ سخن بنا دیتی ہے۔ اہلِ جاپان اِس کے معاملے میں خاصے حساس بھی ہیں اور اِس میں زیادہ تجربوں کو پسند نہیں کرتے۔

فراست رضوی ہائیکو کی اِن باریکیوں کے ادا شناس ہیں۔ اُنھوں نے ہائیکو کو اس کی تمام پابندیوں کے ساتھ برتا ہے۔ ۵۔۷۔۵ کی عروضی پابندی کے علاوہ وہ اس کی اشاریت کی گہرائیوں میں اُتر گئے ہیں اور کنایوں میں فطرت آشنائی کی روایت کو بڑی فنی چابک دستی سے برتا ہے۔

اس انداز کے ہائیکو اتنی بڑی تعداد میں کہہ لینا اس صنف پر ان کی فنی گرفت کا ثبوت ہے۔ ''کُہر میں ڈوبی شام'' فراست رضوی کی اس فنی مہارت کی آئینہ دار ہے۔''

(ڈاکٹر یونس حسنی)

☆.....☆.....☆

فراست رضوی پچھلے دس بارہ برسوں سے ہائیکو لکھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے بعض ہم عصروں کی طرح فیشن کے طور پر اس صنفِ سخن کو نہیں اپنایا ہے بلکہ اُنھوں نے ہائیکو کی روایت، فنی ساخت، مزاج اور موضوعات کے بارے میں اس صنف کے نقادوں کی تحریروں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے جس کا پرتو ان کے زیرِ نظر مجموعے ''کُہر میں ڈوبی شام'' میں شاملِ طبع زاد ہائیکو میں جھلکتا ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پچھلی دو دہائیوں میں ہائیکو کو برصغیر بلکہ بالخصوص پاکستان میں جو فروغ حاصل ہوا ہے اس کی مثال کسی اور درآمد شدہ صنفِ سخن سے نہیں دی جا سکتی۔ اس مختصر عرصے میں صرف ہائیکو پر مشتمل اب تک درجنوں مجموعے شایع ہو چکے ہیں لیکن ان میں سے چند ایک ہی اس نازک اور حساس صنفِ سخن کے مزاج اور فنی تقاضوں پر پورے اُترتے ہیں۔ مقامِ امتنان ہے کہ ''کُہر میں ڈوبی شام'' کا شمار ان چند مجموعوں میں کیا جائے گا۔

فراست رضوی نے ہائیکو کے معروف مضامین، موسم، مناظر اور مظاہرِ فطرت وغیرہ تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ذہین اور باشعور فن کار ہونے کے ناتے اُنھوں نے انسانی رشتوں اور معاشرتی مسائل کے علاوہ کائنات کی بے ثباتی کو بھی اپنی فکر کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے ہائیکو کا یہ رخ نہایت مؤثر اور نمایاں ہے جو اُن کی شناخت بھی ہے اور ہائیکو نگاری کا جواز بھی۔'' (محسن بھوپالی)

☆.....☆.....☆

''فراست رضوی کا ہر ہائیکو ایک نیا مضمون پیش کرتا ہے۔ محبت کے موضوع پر یہ ہائیکو اس لیے قابلِ ذکر ہیں کہ محبُوب ان کا ہم سفر دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے یہاں اُردو غزل میں شاعر غائب محبُوب سے محبت کا اظہار کرتا ہے جب کہ جاپانی شاعری میں بیوی سے بھی محبت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ جو فطری ہے۔''

(ڈاکٹر محمد امین)

☆.....☆.....☆

''اس کتاب کے زیادہ تر ہائیکو بین حقیقت، فطرت کے مناظر اور داخلی احساسات کی تجسیم، تشبیہ اور علامت کے ذریعے، امتزاج کا ایک قابلِ تقلید ماڈل ہیں جو جاپانی ہائیکو اور اُردو شاعری خصوصاً غزل کی روایت کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ ان ہائیکو کی ساخت میں موسم، پرندے، باغ، بارش، مولسری، چیری، چاند، بادل، پیڑ، کیاری، ہارسنگھار، کہرہ، سمندر اور دوسرے فطری مناظر فطرت نگاری یا ہائی پر ریلیٹی کے زمرے میں آتے ہیں اور جاپانی ہائیکو کے مزاج کے مطابق ہیں۔ ایسے IMAGES کو جذبات اور احساسات اور داخلی کیفیت کی بنیاد بنایا گیا ہے۔''

(ڈاکٹر فہیم اعظمی)

☆.....☆.....☆

''جہاں تک ہائیکو کی بات ہے یہ انسانی ذہن و جذبات اور خیالات کو اپنے اندر جگہ دیتی رہی ہے۔

فراست رضوی کے ہائیکو میں درد مندی کی کیفیت خاندان اور انفرادی صعوبتوں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دروں بینی، خستگی اور سوز و گداز کے عناصر سماجی حالات کی اثر آفرینی کے تحت نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ ان کی داستانِ دردمندی روایتی نہیں بلکہ حقیقی ہے اور اُن کی دل گرفتگی ایک منظم و تربیت یافتہ حیثیت رکھتی ہے جو مسلسل مشاہدے کے بعد درجۂ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ لیکن فراست رضوی نے اس کے اظہار میں ایک خاص سلیقہ اور مہارت سے کام لیا ہے۔''

(ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

☆.....☆.....☆

''فراست نے جہاں ہجر و فراق، وصل و وصال، محرومی، ناکامی اور نا آسودگی وغیرہ کو ہائیکو کا موضوع بنایا ہے وہاں اس نے دنیا کی لاحاصلی اور موت کی حاصلی کو بھی ہائیکو کی اصل میں اُجاگر کیا ہے۔

''کُہر میں ڈوبی شام'' کے ماہیا روپ ہائیکوز میں صبحِ اودھ کے رنگ بھی ہیں اور شامِ بنارس کی خوشبو بھی۔ ان میں چاند راتوں کے خوابیدگی بھی ہے اور دھوپ دنوں کی جاگرتی بھی۔ یہ ہائیکوز جہاں حسن و عشق کی غمازی کرتے ہیں وہاں حالاتِ حاضرہ اور وارداتِ ناظرہ کی طنازی کا پتا بھی دیتے ہیں۔ آخر میں صرف اور صرف اتنا کہوں گا کہ وہ کوئی بھی دیدۂ بینا کیوں نہ ہو اسے کسی طرح اور طور سے دلِ مضطر سے مَفَر نہیں۔''

(دل نواز دل)

☆.....☆.....☆

''فراست رضوی ہائیکو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اس صنفِ شعری کو احساسِ ذات کے نئے ابعاد سے متمول کیا ہے۔ فراست رضوی کے ان شعر پاروں کے بہ غور مطالعے سے کھلتا ہے کہ مشاہدے کی نئی لطافتیں اور جذبے کی نئی اُفتادیں ایسی بھی ہیں جو غزل کی چمک دمک سے الگ ہائیکو کی لپک جھپک کی تمنائی ہیں۔

فراست رضوی نے ہائیکو میں جذباتی، خیالی اور ساختیاتی کاوشوں کو خوبی سے کامیاب و بامراد کیا ہے۔ ان کے فن کی صحیح پرکھ اور درست تفہیم پڑھنے والے کو ہائیکو پر ایمان لے آنے پر مجبور کر دے گی کہ ان کے یہاں جدید نظم کی لفظیات کے شانے غزل کی رمزیت کے چھینٹے لوک رس میں گھل مل کر ہائیکو میں شعریت کے حیرت ناک نمونے دکھاتے ہیں۔ اسی لیے فراست رضوی کے ہائیکو کی کتاب ''کُہر میں ڈوبی شام'' اُردو میں سخن سنجی کے نئے دروازے کھولے گی۔''

(آصف ثاقب)

☆.....☆.....☆

۲۔ کتابِ رفتہ

کتابِ رفتہ مارچ ۲۰۰۷ء میں اکادمی بازیافت، کراچی نے شایع کی جو غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان غزلیات کو جناب ظفر اکبر نے منتخب کیا ہے اور اس کتاب کا سرورق انور سمیع نے بنایا ہے۔ ۲۵۶ رصفحات کی ضخامت لیے اس مجموعے کی قیمت ۲۰۰ رروپے ہے۔ جناب فراست رضوی نے اپنی اس کتاب کا انتساب اپنے والدِ گرامی سیّد لیاقت حسین رضوی کے نام کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل کلام پر پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر انیس اشفاق، احمد جاوید، شہزاد احمد، احمد ہمدانی اور احمد ندیم قاسمی نے اظہارِ خیال کیا ہے۔

آیے ان ناقدین کے مضامین سے اقتباسات ملاحظہ کرتے ہیں تاکہ کتاب اور صاحبِ کتاب کا بھرپور تعارف سامنے آسکے:

''فراست کی شاعری کے بارے میں میرا پہلا اور فوری تاثر یہ ہے کہ اس کے گہرے جذبہ و احساس میں جو انفرادیت ہے، اُسی نے فراست کے اُسلوبِ اظہار کو بھی سنوارا ہے۔ یوں شاعر نے اس کلاسیکل تکمیل کی طرف قدم بڑھایا ہے، جو میر، غالب، اقبال اور فراق کی غزل کی پہچان ہے۔ میں اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کرنے کو تیار ہوں کہ فراست کی غزل دورِ حاضر کے چند دوسرے شعرا کی طرح مستقبل گیر غزل ہے اور کم سے کم، رواں صدی کے نصف تک تو یہی غزل معیارِ فن قرار پائے گی۔''

(احمد ندیم قاسمی)

☆.....☆.....☆

''فراست رضوی سے میں کئی بار ملا ہوں مگر اُس نے مجھے یہ تاثر نہیں دیا کہ وہ شاعر بھی ہوسکتا ہے۔ اب ایک مدت کے بعد جب مجھے اس کا یہ مسودہ موصول ہوا تو مجھے لگا کہ میں کسی اور شخص سے ملاقات کر رہا ہوں۔ پہلے تو لگتا تھا کہ وہ بحث مباحثے کا بہت شوقین ہے۔ کچھ ایسا ہی تاثر مجھے اس کے ٹیلی وژن پروگراموں سے بھی ملا تھا۔ لیکن اپنی غزلوں میں وہ ایک حساس، تنہا اور دردمند انسان نظر آیا جو زندگی کی اقدار کی شکست اور وقت کی گردشوں کے تغیر سے ملول اور افسردہ ہے۔ مباحث میں نکتہ آفرینی کرنے والے ایسے تو نہیں ہوتے ..... کیا میں اسے ایک منقسم شخصیت قرار دوں؟ کبھی کبھی منقسم شخصیت میں ایک رخ ایسا بھی ہوتا ہے، جو اپنے سارے پہلوؤں کو پوری طرح جانتا ہے۔ کیا اس کی غزلیں اس کی شخصیت کا وہی پہلو ہیں؟

جاتے ہیں کہیں اور پہنچتے ہیں کہیں اور
اک اور بھی جادہ پسِ جادہ تو نہیں ہے

طوالت مری گفتگو میں جو تھی
مرے پاس کہنے کو تھا کچھ نہیں

دوسری بات جس نے مجھے چونکایا، یہ تھی کہ وہ اتنا حیرت زدہ اور آزردہ کیوں ہے؟ زندگی جیسی نظر آتی ہے وہ اسے قبول کیوں نہیں کر لیتا، آخر ہمارے اکثر شعرا یہی کام تو کرتے ہیں اور شاید اسی لیے وہ مقبول بھی ہیں۔ وہ بغاوت بھی کرتے ہیں تو اس میں ایک رومان ہوتا ہے، مگر فراست جب شعر کہتا ہے تو اس کی بغاوت میں ایک تہذیب ہوتی ہے۔ وہ بہت سے قدیم اسالیب اور مضامین سے انحراف کرتا ہے لیکن زندہ کلاسیک کا احترام اس کی تخلیقی سرشت کا حصّہ ہے:

باہر سے آئے مفہوم سارے
لفظوں کے اندر کب تھے معانی
چھپایا خود کو اپنی گفتگو میں
سخن ایسے کیے ایجاد ہم نے

اور آخری بات یہ کہ اس نے معروض اور روایتی غزل کو اپنی ذاتی تشکیک، اپنے تصورِ حیات اور اپنے خاص تصورِ شعر کے حوالے سے دیکھا ہے، جس کے باعث وہ اپنے ہم عصر شاعروں سے مختلف بھی لگتا ہے اور منفرد بھی۔''

(شہزاد احمد)

☆☆☆

''ایسی جدیدیت جو صرف انفرادی حسّی تجربے پر اصرار کرے اور باہر کی معروضی دنیا سے منھ موڑ لے، میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ میں بودلیئر اور میلارمے کی طرح عالم اشیا کو التباس نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اچھی اور بڑی شاعری خلا میں تشکیل نہیں پاتی، میں سماجی حقیقتوں کو ادب میں بنیادی اہمیت دیتا ہوں۔ اسی لیے میں فراست رضوی کی غزل کا مداح ہوں کہ اس کے جذبے، احساس اور خیال کے پیچھے جیتے جاگتے زر پرست شہر ہیں، اُجڑی ہوئی محفلیں ہیں، خوف اور تنہائی کی سیاہ چادروں میں لپٹی راتیں ہیں، خود غرض اور پُر شور دن ہیں، محبت اور تعلق کے ایسے المیے ہیں جو ہمارے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔

فراست رضوی کی غزل میں جو تصورِ فنا ہے وہ کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ اُردو شاعری میں زندگی کی ناپائیداری کا یہ نظریہ بہت پرانا ہے لیکن فراست نے اس میں جدید طرزِ احساس اور ذاتی تجربے کی آمیزش سے ایک نیا پن اور حُسن پیدا کر دیا ہے۔ وقت گزراں کا جبر اور اس سے پیدا ہونے والے دُکھ کا اظہار فراست کی غزل میں ایک دل کش اور دل نشین اُسلوب کے ساتھ ہمیں جگہ جگہ متوجہ کرتا ہے۔

وہ اُجڑے ہوئے شہروں کا نوحہ گر ہے مگر ایک نئی دنیا کے خوابوں سے اس کی آنکھیں خالی نہیں۔ زبان کا تخلیقی استعمال، استعجاب انگیز جمالیات، نازک تمثیلیں اور روایت کی آگہی، ان تمام اجزا نے فراست کی غزل کو عصری شاعری میں ایک انفرادیت عطا کر دی ہے۔ اگر میں سارتر کی زبان میں کہوں تو میں، کہوں گا کہ فراست نے معروضی دنیا کے متوازی اپنی شاعری میں ایک الگ دنیا تعمیر کی ہے جو کوئی معمولی بات نہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس کے اندر کی دنیا باہر کی سماجی دنیا سے لاتعلق نہیں ہے۔

میں نے اپنے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ میر کا مزاج ہزار انفرادی شان رکھنے کے باوجود اجتماعی ہے۔ فراست کی شاعری میں جو ذاتی دُکھ ہے اس کے پیچھے بھی صنعتی معاشرے کا کھوکھلا پن، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت اور جدید انسان کا احساسِ اجنبیت صاف نظر آتا ہے۔ ''کتابِ رفتہ'' کی غزلوں میں تخلیق اور تکنیک کے نئے رخ اور جدید حسیت کے جو نئے زاویے ظاہر ہوتے ہیں، اُنھوں نے ان غزلوں کی شاعرانہ قدر و قیمت میں بے انتہا اضافہ کر دیا ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ فراست رضوی کی غزل ہماری تہذیب اور شعری روایت کے عملِ ارتقا کا ایک بڑا مظہر ہے۔''

(احمد ہمدانی)

☆.....☆.....☆

''فراست کی زندگی اور طرزِ احساس میں یک رخا پن نہیں ہے۔ اس میں تنوع ہے، حزن و ملال کے ساتھ رنگِ نشاط بھی ہے۔ مصائبِ زمانہ کی گرد کے ساتھ ساتھ اس کے پیراہنِ سخن کے اندر حسن و محبت اور ہجر و وصال کی خوشبو بھی ہے۔ یہ کلام اپنے اندر تجربات اور محسوسات کی ایک سیر گاہ رکھتا ہے۔ اس سے گزر کر ہر سخن شناس نہ صرف شاعر کو بلکہ خود اپنی ذات اور اپنے زمانے کو پانے کی مسرت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ ارسطو سے لے کر آج تک شاعری کی غایت یہی بتائی گئی ہے کہ حزن و ملال کے باوصف اس کا منصب حظ اور ذہنی مسرت بہم پہنچانا ہے اور آپ ''کتابِ رفتہ'' کے مطالعے سے یقیناً یہ محسوس کریں گے کہ فراست اپنے قاری کو قدم قدم پر وہ جمالیاتی مسرت فراہم کرتے ہیں جو سچّی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔''

(پروفیسر سحر انصاری)

☆.....☆.....☆

''میں نے فراست کی شاعری کی توصیف نہیں کی ہے، اس کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ بڑا شاعر ہو یا نہ ہو لیکن سچّا شاعر ضرور ہے اور جو سچّا شاعر ہے اس کے یہاں بڑی شاعری کے امکانات صاف نظر آتے ہیں۔ فراست کے یہاں بھی یہ امکانات صاف نظر آ رہے ہیں۔ اس کے لیے صرف جذبے ہی اہم نہیں ہیں بلکہ وہ شاعرانہ قالب بھی اہم ہے جو اِن جذبوں میں شاعرانہ رفعت پیدا کرتا ہے۔ اس کی شاعری نہ تو رجحانوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھی ہے اور رجحانوں کے زیرِ اثر اس کی تفہیم کی جائے گی۔ رجحان آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے لیکن اس کی شاعری اپنے قاری سے محروم نہیں رہے گی اس لیے کہ یہ ہمیشہ پڑھی جانے والی شاعری ہے۔ کچھ نافہم نقادوں کی طرح ممکن ہے بعض پڑھنے والے بھی کہیں کہ اس شاعری میں گم شدہ زمانوں کی نوحہ خوانی کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن فراست اسی نوحہ خوانی کو اہم جانتے ہوئے شان سے کہتا نظر آئے گا:

دکھوں کے پھول تو ہیں، زخم تو ہے، داغ تو ہے
ہرا بھرا مرے سینے میں کوئی باغ تو ہے"

(ڈاکٹر انیس اشفاق)

☆......☆......☆

"کتابِ رفتہ میں فراست رضوی نے اُن پیچیدہ مگر غیر مبہم کیفیات تک رسائی حاصل کر لی ہے جو ذہن کے لیے سادہ ہیں اور تاثیر میں دقیق، یہ کیفیات شاعری میں معنی خیزی کے عمل کو تکمیل تک پہنچانے کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب غیر مربوط مضامین اور منتشر احساسات کا انبار نہیں ہے بلکہ ایک ہمہ گیر تجربے کا مسلسل بیان ہے۔ یہ تجربہ اپنی بناوٹ اور اظہار دونوں پہلوؤں سے اس اکائی کی طرح لگتا ہے جو تصور اور احساس کے ادغام سے وجود میں آتی ہے۔ فراست کے احوال کو تھیمیٹک بنا دیا ہے۔ یہ بڑی نادر بات ہے اور اسی کی بدولت "کتاب رفتہ" میں بننے والا تقریباً ہر منظر تخیل کی نقش گری کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایسی واقعیت پر مبنی ہے جو مثال کے طور پر تاریخ کا خاصہ ہے۔ پوری کتاب میں شاید ہی کوئی شعر ہو جس سے تشکیل پانے والی فضا واقعاتی دروبست نہ رکھتی ہو، عین ممکن ہے کہ ہم ان احوال کے تجربے سے نہ گزرے ہوں، تاہم یہ ممکن نہیں کہ ان کا انکشاف ہمیں اجنبی لگے۔"

(احمد جاوید)

☆......☆......☆

فراست رضوی کے جس کلام کی مذکورہ بالا ناقدین نے محاسن گنوائے ہیں آیئے اس کلام سے چند اشعار ملاحظہ کرتے ہیں:

زیست کرنے کا ہنر آخر مجھے بھی آ گیا
ایک چہرہ اپنی خاطر، اِک زمانے کے لیے

☆

غیر کی شکایت کیا شوقِ لذتِ غم سے
میں بھی ہو گیا شامل اپنا دل دُکھانے میں

☆

کوئی شے دائم نہیں ہے دل لگانے کے لیے
منظروں کو دیکھتا ہوں بھول جانے کے لیے

☆

خیالوں کے خنجر بہت تیز ہیں
وہی خوش ہے جو سوچتا کچھ نہیں

☆

میں کوزہ گر کی دکاں پر رکھا رہا تا عمر
کوئی چراغ شکستہ کے دام کیا دیتا

فراست رضوی کو زبان کی نازکیوں کا شعور بھی ہے اور اندازِ بیان کا اور اک بھی۔ لفظیات کا انتخاب، مصرع کی بُنت، الفاظ کا چناؤ اور تراکیب کے استعمال سے پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ کلام فراست رضوی کا ہے۔ یہ بات شاعر کو صاحبِ اُسلوب ثابت کرتی ہے۔ اُن کے کلام میں فکری وفنی اور اُسلوبیاتی انفرادیت موجود ہے جس نے اُنھیں اُن کے ہم عصر و ہم عمر شعرا میں منفرد و ممتاز کر دیا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار کو اگر بہ نظرِ غائر دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا تمام کلامِ شعری جمالیات سے مزین ہے، اشعار کے سر پر غنائیت کا تاج رکھا ہے اور شعریت تنِ شعر میں روح کا کام کر رہی ہے اور ندرتِ خیال نے جسمِ شعر میں جان پیدا کر رکھی ہے۔ فراست رضوی کا کلام عام شعرا سے یک سر مختلف اور فکر و خیال کی بنیاد پر ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عہدِ حاضر کے ایک اہم اور نمائندہ شاعر کی حیثیت سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔

☆......☆......☆

۳۔ دردکی قندیل

درد کی قندیل رُباعیات کا مجموعہ ہے جس میں ۴۲۱ رُباعیات شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اکادمی بازیافت، کراچی نے جنوری ۲۰۱۴ میں شایع کیا تھا جس کے صفحات ۲۴۰ اور قیمت ۳۰۰ روپے ہے۔ کتاب کا سرورق شمیم باذل نے بنایا ہے۔ شاعرِ موصوف نے اپنے اِس مجموعے کا انتساب اپنے یارِ قدیم ڈاکٹر انیس اشفاق کے نام کیا ہے۔ اس کتاب پر علامہ طالب جوہری، ڈاکٹر جمیل الدین عالی، ڈاکٹر تحسین فراقی اور طلعت حسین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

رُباعی فارسی ادب میں بھی شہرت رکھتی ہے اور اُردو ادب میں بھی معروف ہے۔ رُباعی کے مخصوص اوزان کی بنیاد پر اِسے دیگر اصنافِ سخن میں اختصاص حاصل ہے اور اِس کے اوزان کی اختراع کا سہرا رودکی کے سر ہے جو فارسی شاعر تھا۔ رودکی سے قبل رُباعی کا وجود ملتا ہے جو دوبیتی اور ترانہ کے نام سے موسوم تھا، مگر رودکی نے اِس کا نام رُباعی رکھا اور اِس کے زحافات کے نام اور اوزان تجویز کیے، مگر رودکی کے بعد رُباعی کے دو شجرے اوزانِ اخرب اور اخرم، خواجہ حسن قسطان خراسانی نے بنائے جو آج تک مستعمل ہیں۔ اُردو رُباعی گو شعرا میں غالب، میر انیس، مرزا دبیر، الطاف حُسین حالی، یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، منظور حُسین شور، امجد حیدر آبادی، فدا خالدی، راغب مراد آبادی، محسن اعظم محسن ملیح آبادی، رفیع الدین راز، فراست رضوی، خالد کامل اور منظر عارفی شامل ہیں۔

جناب فراست رضوی کے پہلے مجموعے درد کی قندیل پر ناقدینِ فنِ شاعری نے اپنی جن گراں قدر آرا کا اظہار کیا ہے اُن سے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں تا کہ بہ حیثیت رُباعی گو جناب فراست رضوی کا فن اور اُردو ادب میں اُن کا مقام سامنے آ سکے۔ ملاحظہ ہوں:

"فراست رضوی اور میرے تعلقات پر اب تک چار دہائیوں کے سائے پڑ چکے ہیں۔ فراست میرے دوستوں میں سب سے زیادہ خوش کلام اور ظریف ہے۔ وہ بہت شگفتہ مزاج اور بہ ظاہر اپنی ذات سے بے نیاز ہے، لیکن وہ جیسا نظر آتا ہے اندر سے بالکل ویسا نہیں ہے۔ محفل میں وہ ہم سے اپنا اندرونی رُخ چھپا جاتا ہے مگر شاعری ایک ایسا میڈیم ہے جس میں وہ اپنے [illegible] کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اُس کی رُباعیوں میں ایک

Purity محسوس ہوئی۔ اُس کے یہاں ہر معروضی خیال اُس کے باطنی سچ سے مل کر ہی ایک Scenario بناتا ہے۔اس کی رباعیوں میں بیانیہ بھی تمثیل کا روپ دھار لیتا ہے۔وہ اپنی شاعری میں پیکر تراشی یا شبیہ سازی نہیں کرتا، وہ زیادہ سے زیادہ اشاریت یا علامت کے ٹکڑوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ یہ مالارمے کی ست انداز چہرہ نمائی سے منسوب تمثالیت ہے۔تمثالیت کا یہی وہ نظریہ ہے جسے بعد میں ایلیٹ نے اپنی Objective Correlative تھیوری کا حصّہ بنایا۔''

(طلعت حُسین)

☆.....☆.....☆

''فراست رضوی کی رباعیات پڑھ کر مجھے یک گونہ مسرت و حیرت ہوئی۔اُنھوں نے نہ صرف اپنی ہنر مندانہ چابک دستی سے رباعی کے عروضی و فنی تقاضوں کو پورا کیا ہے بلکہ جا بہ جا مضامینِ نو کے انبار بھی لگا دیے ہیں۔

ان کی رباعیاں بھرتی کی رباعیاں نہیں ہیں۔ ان میں تخلیقی طاقت اور تخئیل کی وسعت موجود ہے۔ زبان و بیان پر اُن کی گرفت لائقِ تحسین ہے۔فکر، احساس، تجربہ اور مشاہدہ ہر رنگ اُن کی رباعیات میں بسا ہوا ہے۔ ان کا اُسلوب انتہائی دل کش ہے۔ فراست رضوی کی رباعیاں یک نخی نہیں، کثیر الجہت ہیں۔ بلاشبہ فراست رضوی کی رباعیات کے اس مجموعے کو نقادانِ فن قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔''

(ڈاکٹر جمیل الدین عالی)

☆.....☆.....☆

''خوش فکر شاعر اور منفرد دانش ور جناب فراست رضوی کی رباعیات کا پیشِ نظر مجموعہ اپنے متنوع معانی و مضامین کے اعتبار سے معاصر شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

فراست کی ان رباعیات کی پہلی خصوصیّت ان کا غیر معمولی معنوی تنوع ہے۔تدبر، تفکر، دردمندی، بصیرت اور بالغ نظری کے عناصر سے فیض یافتہ یہ رباعیاں قاری کو بڑی حیرت سے دوچار کرتی ہیں۔ ان رباعیات کا قاری ایک ایسے شاعر سے متعارف ہوتا ہے جس کا مشاہدہ باریک اور مطالعہ وسیع ہے، جس کی آنکھ باطن اور خارج دونوں پر لگی رہتی ہے، جو تنگ نظری اور عدم رواداری پر دل گرفتہ نظر آتا ہے، جسے منافقتوں کی دوچہرگی خوش نہیں آتی، جو ایک طرف دعا فروشوں اور جہالت زادوں سے برسرِ جنگ ہے تو دوسری طرف مغربی استعمار کے خوں آشام بھیڑیوں کی عیاریوں اور دسیسہ کاریوں سے بھی ہمیں ایمائی انداز سے باخبر رکھتا ہے۔''

(ڈاکٹر تحسین فراقی)

☆.....☆.....☆

''مختصر یہ کہ اساتذہ نے رباعی گوئی کے جتنے تقاضے اور شرائط بیان کی ہیں، فراست رضوی اُن سب پر پورے اُترتے ہیں، یعنی علم، اظہار پر قدرت، شعری جمالیات کا لحاظ، عروض پر گرفت، زبان دانی اور رباعی کا چوتھا مصرع لکھنے کا سلیقہ۔ میرا فراست کو مشورہ ہے کہ وہ رباعیات لکھنے کے اس کارِ احسن کو جاری رکھیں، کیوں کہ اس وقت اچھی رباعیات لکھنے والے شعرا ناپید ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ صاحبانِ فکر اور اربابِ ذوق اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے اور فراست رضوی اتنے شان دار مجموعۂ رباعیات پر لائقِ تحسین ہیں۔

(علامہ طالب جوہری)

☆.....☆.....☆

ناقدینِ فنِ شاعری کی مستند آرا اور جناب فراست رضوی کی رُباعیات کے مطالعے کے بعد یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُن کے افکار میں بھرپور توانائی اور اُسلوب میں دل کشی ہے۔ اُنھوں نے اپنے فکر و نظر کی بالیدگی میں زبان و بیان کی رنگا رنگی میں توانا نظر آتے ہیں۔

اُن کے فکری اعصاب بہت مضبوط ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے اِس دشت کی سیاحی میں مشغول ہیں، مگر نہ تو اُن کا سانس اُکھڑا ہے اور نہ اُنھیں تھکن کا احساس ہوا ہے۔ اُن کی رُباعیات کا کینوس بہت کشادہ ہے۔ وہ ہر انسان اور اُس کی زندگی کو مرکز و محور بنا کر ہر موضوع پر رُباعی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی رُباعیات میں زندگی متحرک نظر آتی ہے۔ زیرِ مطالعہ مجموعے سے چند رُباعیات پیشِ خدمت ہیں:

کچھ کام نہیں ہجر کے مقتولوں کو
بھولا نہیں ساون میں پڑے جھولوں کو
بچپن کا پرانا گھر یاد آتا ہے
جب دیکھتا ہوں موگرے کے پھولوں کو

☆

یخ بستہ ہے ماہِ زرد اور رات طویل
افسردہ ہوائے سرد اور رات طویل
کیا جانے سحر تک میں رہوں یا نہ رہوں
بڑھتا ہوا دل کا درد اور رات طویل

☆

موجودیِ مبہم کی نشانی کی تلاش
دیا میں جوازِ عمرِ فانی کی تلاش
لایعنی شب و روز میں کرتے ہی رہے
ہم اپنے وجود کے معانی کی تلاش

☆

رشتہ تھا بھروسے کا جسے توڑ گئی
اِک کوچۂ حیرت سے مجھے جوڑ گئی
نکلی تھی حقیقت کے سفر پر ہم راہ
رستے میں مگر عقل مجھے چھوڑ گئی

☆

دنیا سے نہ دل لگاؤں کاہل رہ جاؤں
طوفاں نہ بنوں صورتِ ساحل رہ جاؤں
وہ علم جو انکارِ خدا کرتا ہے
اُس علم سے بہتر ہے کہ جاہل رہ جاؤں

☆.....☆.....☆

امین ساجد سعیدی کا نعتیہ مجموعہ ''حسن ازل'' صنائع کا مرقع

پروفیسر ڈاکٹر محمد نعیم گھمن/لاہور

اصنافِ سخن میں نعت کا لفظ جیسے ہی گوش برآواز ہوتا ہے ذہن کے چمن میں حضور نکہت مآب ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کی تعریف وتوصیف کے پھول کھلتے کھلتے مہکنے لگتے ہیں جو روح کی بالیدگی اور ایمان کی تازگی کا باعث بنتے ہیں نعتِ سرورِ کونین ﷺ کی ترقیم ازل سے ابد تک ہوتی رہے گی۔اس کو رقم کرنے والے اس سعادت سے بہرہ مند ہوتے رہیں گے چمنستانِ نعت گویان میں امین ساجد سعیدی بھی ہے

امین ساجد کا تعلق حاصلپور سے ہے۔اس سے میری نیازی مندی کئی برسوں سے ہے۔یہ حاصلپور کی شعری روایت کا معتبر حوالہ ہے۔امین ساجد مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔اب ان کے سخن کا رخ نعت اور مناقب کی طرف ہے۔ان کو غزل گوئی میں بھی دسترس ہے مگر انہوں نے زندگی کا مقصد ہی مدینہ پاک کے گلی کوچوں میں صدائیں لگانا بنالیا ہے ۔امین ساجد کے نعتیہ اور مناقب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

خوش بختی امین ساجد کی دہلیز نشین ہے۔اس کو گزشتہ دو چار سالوں میں ان کی کتاب مدینہ یاد آتا ہے پر صدراتی قومی سیرت ایوارڈ اور تجلی ءحسنِ ازل پر صوبائی سیرت ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے کس کو خبر تھی کہ حاصلپور کے مضافاتی علاقے چھونا والا سے تعلق رکھنے والا امین ساجد ایک دن نعتیہ شاعری میں اپنا منفرد مقام بنائے گا۔ان کی پختہ کاری کی گواہی ان کے اشعار دیتے ہیں۔انہوں نے طویل مدت شعروسخن کی وادی میں چپ چاپ ریاض کیا ہے۔وہ اپنے دوستوں کی محفل میں شعر سناتے تھے۔وہ چپ چاپ شاعری کے اسرار و رموز سے شناسائی حاصل کرتے رہے۔انہوں نے عمر عزیز کے کئی سال شعری اسرار و رموز سیکھنے میں گزار دیئے۔دوست کبھی ان کو کہتے کہ اپنا کلام چھپوالیں تو بات کو پھیر دیتے تھے اور ہمیں یوں لگتا تھا کہ ان کو اپنی شاعری کو چھپوانے کی کوئی جلدی نہیں۔اب پختہ عمر میں ان کے پے در پے شعری مجموعے چھپ رہے ہیں تو اب محسوس ہوتا ہے کہ ان کا یہ انتظار بے جا نہ تھا بلکہ طویل شعری مشقت نے ان کو کندن بنا دیا ہے۔اس پختہ کاری کا اثر ان کے اشعار میں دکھائی دیتا ہے۔امین ساجد کی شاعری کا نمایاں پہلو پختگی اور فنی ثقاہت ہے۔دور دراز علاقے میں رہنے کے باوجود امین ساجد کی پہچان ملک بھر کے ادبی حلقوں میں ہو چکی ہے۔امین ساجد کو ہم نے ایک دن کہا کہ آپ کو غزل بھی کہنی چاہیے تو ہنس کے کہنے لگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں جو لطف ہے وہ غزل میں کہاں مگر میرے اصرار پر نیم رضامندی کا اظہار کر دیا۔امین ساجد کی روحانی نسبت کاظمی خاندان سے ہے۔انہوں نے غزالی زماں سید احمد سعید کاظمی کے مناقب پر مشتمل مرحبا کاظمی کتاب لکھی امین ساجد آل محمد ﷺ کا عاشق ہے۔اس نے شاہ کربلا کی بارگاہ میں بھی مناقب کا مجموعہ شاہ است حسین پیش کیا ہے۔

امین ساجد کی کتاب ''تجلی ءحسنِ ازل'' نعتیہ مجموعہ میرے پیشِ نظر ہے اس کا حسن یہ ہے کہ اس مجموعے میں شامل تمام نعتیں کسی صنعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔صنعتوں کا برمحل استعمال شعراء اپنے اشعار میں تو کرتے ہیں مگر یقیناً یہ پہلا مجموعہ ہے جس میں ہر نعت کسی نہ کسی صنعت میں لکھی گئی ہے۔یہ اک منفرد اور اچھوتا کام ہے۔امین ساجد کی یہی جدت اور منفرد طرزِ سخن ان کو اپنے ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔لطف کی بات تو یہ ہے عہد رواں ہر سو تسہل پسندی کا غلبہ ہے۔عمومی طور پر شعراء بھی اس کا شکار ہوتے ہیں۔وہ شاعری کے رموز جاننے کے لیے محنت نہیں کرتے۔ان کی طبعیت جب موزوں ہو تو شعر کہہ دیتے ہیں۔امین ساجد شاعری میں جان کاوی کا قائل ہے۔اس نے شاعری کی باریکیوں کو سیکھا ہے۔صنعتیں اور ان کا استعمال فنی ہنرمندی کا تقاضا کرتی ہیں ۔عام طور پر شعراء کو ان صنعتوں کے ناموں سے ہی شناسائی نہیں ہوتی جن کو امین ساجد نے اپنی نعتوں میں برتا ہے۔صنعتوں کا استعمال شاعری کے حسن کو نکھار عطا کرتا ہے۔صنعت کے ذریعے تحریر میں حسن اور چستی پیدا ہوتی ہے۔اگر صنعتوں کا استعمال شاعری میں کیا جائے تو اس سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔اس نے اپنی شعری مجموعے "تجلی ءحسنِ ازل "میں جن صنعتوں کو استعمال کیا ہے ان میں سے کچھ اشعار ملاحظہ کریں۔

صنعت واصل الشفعتین کا استعمال کرتے ہوئے امین ساجد نے اپنے مجموعہ میں نعتیں لکھی ہیں۔اس صنعت کا امتیاز یہ ہے جب کوئی بھی شعر پڑھا جائے گا تو لب مل جائیں گے۔اس صنعت کا استعمال کرتے ہوئے امین ساجد نے حضور ﷺ کے پسینہ مبارک کی خوشبو کا ذکر کیا اور دوسرے شعر میں جبریل امیں، رومی وجامی کی خواہش کو کہ درحبیب خدا نصیب ہو جائے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

خوشبو میں پسینہ بھی بہاروں میں تبسم
پھول اپنے بھی مہکا ہے دربار نبی میں
جبریل امیں، رومی و جامی بنے بے خود
نمدیدہ طلب پایے دربار نبی میں

صنعت فوق النقاط میں ایسے لفظ لائے جاتے ہیں جن کے اوپر نقطہ ہو۔امین ساجد نے اپنی نعت اس صنعت میں بھی کہی ہے۔وہ ان اشعار میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں عجز وانکساری سے التجاء کر رہے ہیں۔

ہونٹوں سے ورد نعت ہر دم رواں دواں
ہم شہر مصطفے کو ہی دامان تر گئے
اشکوں کے ساتھ نعت سرائی حضور کی
عنوان نعت خود ہی سنور کر نکھر گئے

صنعت غیر منقوطہ میں ایسے لفظ لائے جاتے جن میں نقطہ کا استعمال نہ ہو۔ امین ساجد نے صنعت غیر منقوطہ کا خوب استعمال کیا ہے۔ انہوں اس نعت میں ہر عاشق کے دل کی بات کو شعر کا روپ دیا ہے۔ عشاق تو دل میں ہر وقت مدینہ کے تاجدار کو یاد کرتے ہیں اور حضور ﷺ کی ذات مبارکہ کا کرم ان کے گرد حالہ بنا لیتا ہے۔ رنج و الم ان کے قریب بھی نہیں آتے۔ وہ اپنا حال دل رسول مکرم ﷺ کو جی بھر کے سناتے ہیں۔

حرا سے رسول امم گھر کو آئے
وہ ہے وحی اول ردا ہے اوڑھا دی
الم مٹ گئے سارے ہی اللہ اللہ
اگر کملی والے کو دل سے صدا دی

صنعت سیاق الاعداد میں شاعر اعداد کا استعمال کرتا ہے۔ صنعت سیاق الاعداد شعر کہنے کا ایسا انداز یا خوبی ہے جس میں مجموعہ حاشین کے مطابق بالترتیب یا بلا ترتیب اعداد ذکر کیے جائیں، جس سے مضمون و شعریت میں بلندی آجائے۔ امین ساجد نے اس صنعت کو استعمال کرتے ہوئے اہل بیت اظہار سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

یہ امت رسول کی بخشش کا ہیں سبب
لاکھوں ادا ہوئے ہیں جو سجدے بتول سے
اک سجدہ رسول ہے، اک سجدہ ء حسین
سجدوں کا ہے وقار دو سجدوں کے طول سے

صنعت تلمیح میں تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ امین ساجد نے صنعت تلمیح کا برمحل استعمال تو کیا مگر اس میں لطافت کا یہ پہلو ہے کہ حضور ﷺ کی دو محبوب ترین ہستیوں کا ذکر مبارک کیا ہے۔ امین ساجد کے ان اشعار سے ان کی عقیدتوں کی بھی خبر ہوتی ہے۔

دیکھے انوار خدیجہ و ابو طالب نے
تھی خبر ان کو کہ بارات کے اندر کیا ہے
عقل حیرت میں ہے انگشت سے چشمے جاری
کوئی بتلائے کہ اس ہاتھ کے اندر کیا ہے
نعت ساجد تو لبوں پر ہی سجائے رکھنا
چھوڑ دنیا کے یہ نغمات کے اندر کیا ہے

صنعت منقوطہ کا شمار پر تکلف صنعت میں ہوتا ہے۔ اس میں شاعر سب الفاظ ایسے لاتا ہے جن میں نقطہ لازم ہوتا ہے۔ اس صنعت کے استعمال میں بھی امین ساجد نے حضور ﷺ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

کریں آپ جب اشارے نبی جی
قدم چومنے آئیں تارے نبی جی
قدم چومنے خوشیاں آتی ہیں چھم چھم
سنیں میرے غم جب بھی پیارے نبی جی

صنعت تضاد کو بھی امین ساجد نے اپنی نعتوں میں استعمال کیا ہے۔ تضاد کا مطلب ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے متضاد الفاظ استعمال کرنا۔ ان کے ہاں صنعت تضاد کے سانچے میں ڈھلی نعت کا اک شعر ملاحظہ کریں۔

دل کو جواب دے دیا دل کے سوال کا
رکھا خیال آپ نے دل کے خیال کا

محاور بندی کا استعمال شاعری کو مقفع اور مسجع بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ضرب الامثال اور محاورات کے استعمال سے شعری حسن بڑھتا ہے۔ امین ساجد نے باغ باغ اور دم میں دم جیسے محاورات استعمال کر کے نعت لکھی ہے۔ ان کا یہ شعر محاورات کا مرقع ہونے کے ساتھ ساتھ گنبد خضراء سے بے پناہ عقیدت کا اظہار بھی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

سبز گنبد پر پڑی جب دور سے میری نظر
آ گیا ہے دم میں دم دل ہو گیا ہے باغ باغ

دوہرا قافیہ کا استعمال بھی حظ اٹھانے کے قابل ہے

سانس لیتا ہوں تو رقص آتا ہے خوشبو کو
جب مدینے سے کوئی جھونکا ہوا دیتا ہے
یہ بجا ہے کہ پیمبر کا لعاب اقدس
ان کے تو شہر کا بھی ذرہ شفا دیتا ہے

تجنیس میں دو لفظوں کا تلفظ میں مشابہ اور معنی میں مختلف ہونا ہوتا ہے۔ تجنیس کی کئی اقسام ہیں۔ امین ساجد نے صنعت تجنیس سرحرفیکو استعمال کرتے ہوئے درود و سلام کی اہمیت کو موضوع بنایا ہے۔

ایک دن دیکھے گا وہ الفت احمد کا اثر
جو درود اور سلام آپ پر پڑھتا جائے

قطعہ۔ صنعت اطراد کو استعمال کیا۔ اس قطعے کا حسن یہ ہے حضور ﷺ کے والدین اور خاندان کے وہ بزرگ جو ساری زندگی ڈھال بن کر آقا ﷺ کی حفاظت کرتے رہے۔ ان کا ذکر جمیل کیا ہے۔

عباس رضی اللہ عنہ، ابو طالب علیہ السلام و حمزہ رضی اللہ عنہ کی ہیں یہ جان
ہے کنبہ ء ذیشان بڑا ماہ مبین کا
عبد اللہ علیہ السلام پدر سیدہ ماں آمنہ بی بی سلام اللہ علیہا
اعلیٰ ہے جو نسب اور حسب سرور دیں کا

امین ساجد نے مذکورہ بالا صنعتوں کے علاوہ بھی کئی دیگر صنعتیں اپنی نعتوں میں استعمال کی ہیں۔ عمومی طور پر شعراء کچھ اشعار میں صنعت کو برتتے ہیں مگر امین ساجد نے جس صنعت کو بھی لیا ہے اسی میں پوری نعت کہی ہے۔ ان کا یہ منفرد کام فنی و فکری لحاظ سے منفرد مقام کا حامل ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ امین ساجد کو عصری مسائل اور آشوب کو بھی نعت کا موضوع بنانا چاہیے جس سے ان کے نعتیہ کینوس کو مزید وسعت ملے گی۔ نعت گوئی میں اب تو اخلاقیات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ امین ساجد کو قرآنی آیات اور احادیث کے مفاہیم کو بھی نعتوں میں پیش کرنا چاہیے تاکہ ان نعت گوئی میں مزید نکھار و وسعت آسکے۔

سادہ اور پر اثر لہجے میں سوالی بن کر در مصطفے ر ﷺ پر صدائیں دینا ان کی نعت گوئی کا بنیادی وصف ہے۔ امین ساجد آقا علیہ السلام کی آل کا غلام ہے۔ اس کی زندگی توصیف پیمبر میں بسر ہو رہی ہے۔ روہی کے اس باسی پر تاجدار بطحار ﷺ کا خصوصی کرم ہے کہ یہ منفرد انداز میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول کرے اور وہ یوں ہی رسول ہاشمی ﷺ کی بارگاہ میں نعتوں کے نذرانے پیش کرتے رہے ہیں۔

سیرت محبوب رب العالمین ﷺ اور بشریٰ رحمٰن

علامہ عبدالستار عاصم/لاہور

نبی کریم ﷺ کی سیرت پر دنیا کی ہر زبان میں کتابیں لکھی گئیں اور تا قیامت لکھی جائیں گی۔ اُردو زبان میں تقریباً پانچ ہزار سے زائد چھوٹی بڑی کتب سیرت پر لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ جناب ڈاکٹر وقار ملک صاحب پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ ابلاغ کے روحِ رواں ہیں اور مکالمے کے حوالے سے انہیں پاکستان میں بانی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ایس ایم ظفر کا مکالمے کے نام سے کئی عشروں سے کام کر رہے ہیں اور یہ کتاب پریس میں جانے کے آخری مراحل سے گزر رہی ہے۔ وقار ملک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کا دستر خوان کسی بھی شہنشاہ سے کم نہیں ہے۔ جب کوئی بھی مہمان ان کے گھر جاتا ہے تو کھانے پینے کا اس طرح انتظام کرتے ہیں کہ جیسے کسی فائیو سٹار ہوٹل میں کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے رزق میں برکت دے اور ان کی کتاب مکالمے کو پورے پاکستان میں پذیرائی بخشے۔ آمین ثم آمین ملک صاحب محبت کے سفیر ہیں۔ ان کی کال آئی کہ محترمہ بشریٰ رحمٰن نے سیرت پر بہت عمدہ کتاب لکھی ہے اگر یہ شائع ہو جائے تو ہم سب کے لیے باعث نجات ہوگی۔ میں نے فوری طور پر ملک صاحب سے کہا کہ ان شاء اللہ یہ شائع ہو جائے گی۔ چند ہی دنوں میں کمپوز ہو گے پروف ہوئی اور چھپ بھی گئی۔ اور جب پہلی کاپی محترمہ بشریٰ رحمٰن کو پیش کی تو قارئین آپ اندازہ لگائیں کہ محترمہ نے فوری طور پر سینے سے لگایا اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی۔ یہ لمحات مقامِ ناز کے لمحات ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ محترمہ کی خواہش تھی کہ یہ کتاب عام ہو جائے اور اللہ کے ہاں قبول ہو جائے۔ اس کی تقریب رونمائی میں پاکستان کی ممتاز شخصیات شرکت کریں یہ میری خواہش ہے۔ چند دنوں کے بعد محترمہ صاحب فراش ہوگئیں اور مقامی ہسپتال میں داخل ہو گئیں۔ فون پہ ان کے بیٹوں سے مسلسل رابطہ رہا اور اُمید کی جا رہی تھی کہ بہت جلد صحت مند ہو کر گھر تشریف لے آئیں گی لیکن ایک بجے کے قریب پروفیسر ڈاکٹر وقار ملک کا فون آ گیا کہ محترمہ بشریٰ رحمٰن ہم میں نہیں رہیں اللہ کے حضور پیش ہوگئیں۔ محترمہ نے بے شمار کتابیں لکھیں، آرٹیکل لکھے، اپنی بائیوگرافی لکھی لیکن ان کا کہنا تھا کہ میری تمام کتابیں ایک طرف اور سیرت النبی ﷺ کی فضیلت بہت زیادہ بلند ہے۔ محترمہ کی شخصیت پر پاکستان کی یونیورسٹیوں میں ایم اے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالہ جات لکھے جا رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ پاکستان کی گلستان تھی۔ بلبل پاکستان تھی اور خواتین کے ادب کے حوالے سے ایک توانا آواز تھی۔ خواتین کے ادب پر جب بھی تاریخ لکھی جائے گی تو محترمہ بشریٰ رحمٰن کا تذکرہ کیے بغیر تاریخ ادھوری رہے گی۔ قارئین سے دُعا ہے کہ آپ سب دعا فرمائیں کہ محترمہ کے جنت الفردوس میں درجات بلند سے بلند فرمائے جائیں۔ آمین ثم آمین ان کی کتاب سیرت محبوب رب العالمین کا پیش لفظ ایم مقالہ سے بھی بڑا مضمون ہے۔ ان کی تحریر ملاحظہ فرمائیں: سیرت النبی ﷺ کا پہلا ماخذ کلام پاک ہے۔ خود رب ذوالجلال اس کے مصنف ہیں۔ جبریل علیہ السلام ناشر ہیں اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کاتب ہیں۔ سید الکونین ﷺ کی سیرت پاک بیان کرنے کے لیے لفظ آسمان سے اترتے ہیں...... آپ ﷺ کے کارنامے بیان کرنے کے لیے لفظ آسمان سے اترتے ہیں۔ آپ ﷺ کی بندہ پروری کو بیان کرنے کے لیے لفظ آسمان سے اترتے ہیں۔ آپ ﷺ کی نیند اور بیداری کا احوال سنانے کے لیے لفظ آسمان سے اترتے ہیں۔ آپ ﷺ کی بے مثال عائلی زندگی بیان کرنے کے لیے لفظ آسمان سے اترتے ہیں۔ غرض آپ ﷺ کی 63 سالہ مطہر و منور زندگی کا پل پل اور لحہ لحہ بیان کرنے کے لیے لفظ آسمان سے اترتے ہیں۔ سیرت طیبہ کو قرآن پاک کے آئینے میں دیکھا جائے گا...... اور اسی آئینے میں دکھایا جا سکے گا۔ جناب ڈاکٹر انور محمد خالد نے اپنی تحقیقی کتاب میں لکھا ہے کہ سیرت مبارک کے اہم عربی ماخذ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرآن مجید (۲) کتب احادیث (۳) کتب مغازی و سیَر (۴) کتب تاریخ (۵) معاصرانہ شاعری (۶) کتب آثار واجنار۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قرآن کریم خود کہتا ہے: وَ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن o ''آپ ﷺ کی سیرت و اخلاق قرآن ہے''۔ قرآن پاک کے علاوہ ...... دنیا بھر کی زبانوں میں سیرت النبی ﷺ کے بارے میں تحریر کردہ کتابوں کا ایک ان گنت ذخیرہ موجود ہے اور جس کے اندر قیامت تک اضافہ ہوتا رہے گا۔ ایک یورپین سیرت نگار نے لکھا ہے: ''محمد ﷺ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا ناممکن ہے۔ لیکن اس میں جگہ پانا قابلِ فخر ہے......!'' (مولانا محمد شفیع) سیّد الکونین ﷺ کی وہ ذاتِ گرامی ہے جو دنیوی اور اُخروی زندگی کے ہر مرحلے کے لیے ایک مکمل دستور العمل ہے۔ راہنمائی اور ہدایت کا لا زوال مینار ہے۔ آپ ﷺ کی جسمانی، روحانی، کرداری تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی صفات کے علاوہ عسکری و جمہوری صفات رشد و ہدایت کا جاری و ساری رہنے والا سر چشمہ ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا اپنی ایجادات پر کتنا ہی فخر کیوں نہ کر لے۔ ان سب تجربات کا ماخذ سیرت نبوی ﷺ سے ہی ملے گا۔

براق کا سفر زمین و آسمان کے وقت میں فرق، خلاء سے گذر کے جانا ..... ستاروں کی کہکشاں بناتے جانا..... چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا ..... خشک کنوئیں میں سے پانی کا نکل آنا۔ چار مرتبہ شقِ صدر کے تجربے سے گزرنا..... اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور سید الکونین ﷺ کو اپنے نور سے پیدا فرما کر اس معمورۂ عالم کو ایک ایسا انسانِ کامل عطا کر دیا ہے کہ اب ان جیسا نہ کوئی ہو سکتا ہے نہ ہوگا۔ ربِّ ذوالجلال نے رسول اللہ ﷺ کو صفاتِ آدم علیہ السلام، شجاعتِ نوح علیہ السلام، حلمِ ابراہیم علیہ السلام، لسانِ اسمٰعیل علیہ السلام، رضائے اسحٰق علیہ السلام، فصاحتِ صالح علیہ السلام، حکمتِ لقمان، بشارتِ یعقوب علیہ السلام، جمالِ یوسف علیہ السلام، صبرِ ایوب علیہ السلام، قوتِ موسیٰ علیہ السلام، نصحِ یونس علیہ السلام، جہادِ یوشع علیہ السلام، لحنِ داؤد علیہ السلام، خوفِ سلیمان علیہ السلام، وقارِ الیاس علیہ السلام، زہدِ عیسیٰ علیہ السلام، علمِ خضر علیہ السلام عطا کر کے اپنے حبیب ﷺ کے درجے پر فائز کر دیا ہے۔ کلامِ پاک کے بعد اسوۂ حسنہ سیرت النبی ﷺ بہت عظیم کتاب ہے۔ اگرچہ یہ کتاب آسمانوں سے نہیں اتری مگر بہت سے وسیلوں سے بندوں کے دلوں پر اتری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچاننے کے لیے اور حبیب خدا ﷺ کے مرتبہ کو پہچاننے کے لیے ..... قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سیرت النبی ﷺ کے مطالعے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کی طرح دو دریا بھی ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ لوگ کلام پاک تو روزانہ بڑی دلجمعی سے پڑھتے ہیں مگر سیرت رسول پاک ﷺ پڑھنے کا انہیں خیال نہیں آتا۔ ساری دنیا کا لکھا ہوا ادب، دنیا کی ہر زبان میں لکھے ہوئے حروف، سارا فلسفہ، منطق، شاعری، سخنوری، سیرت النبی ﷺ کے آگے ہیچ ہیں۔ ایسی کتابیں علم کے زور پر نہیں عشق کے زور پر لکھی جاتی ہیں۔ اہلِ قلم اپنی محبت اور جانثاری کے خواہ کتنے ہی رو پہلے اور نقرئی ورق لگا لیں لیکن حقائق کے لیے انہیں تواریخ اور سابقین کی کتب سے مدد لینی پڑتی ہے۔ میں کہ ایک ذرہ خاک ..... نہ تو علم نہ آگہی ..... نہ فقیہانِ حرم کے آگے زانوئے تلمذ طے کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ علمی طور پر نادار..... عملی طور پر بیکار..... نمازیں پڑھتے پڑھتے اللہ تبارک وتعالیٰ کی توصیف کا سلیقہ آ گیا۔ نماز صرف ایکسر سائز نہیں ہے..... نماز عشق کا پہلا سبق ہے..... اور عشق کا آخری سبق درودِ پاک ہے۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے کی ایک مقدس رات تھی۔ میں بی اے کا امتحان دے کر گھر آئی ہوئی تھی۔ رات کو اٹھ کے سب کو روزے رکھواتی تھی۔ سب سے آخر میں ابا جی کو سحری دینا ہوتی تھی۔ ان کو سحری کھلا کر میں فجر کے بعد قرآن شریف پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی..... نیند میں کیا دیکھتی ہوں کہ کمرے کے ایک کونے سے نور کا ایک جھرنا پھوٹا ہے جیسے فوارہ ہوتا ہے اور وہ برابر اوپر جا رہا ہے ..... میری شریانوں میں خون اتنی تیزی سے دوڑنے لگا کہ شائیں شائیں کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی..... دل زور سے دھڑکنے لگا..... تنفس سے گرما ہوا کے جھونکے نکلنے لگ ..... میں سہمی ہوئی، بند آنکھوں کے ساتھ بت بنی پڑی رہی..... کیا ہوا؟..... کب تک ہوا..... جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا۔ ننگے پاؤں چیختی ہوئی دوڑی اور جا کر سوئے ہوئے ابا جی کے سینے پر گر گئی..... ہذیانی انداز میں ..... ابا جی ..... ابا جی کہتی جاتی تھی..... میرے ابا جی ولی تھے۔ جان گئے کہ کوئی عارفانہ واردات ہوئی ہے ..... میرے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے اور مجھے تسلی دیتے رہے..... میرا چیخنا چلانا ..... خوف سے کانپنا میکانکی انداز میں ہولے ہولے مدھم ہوتا گیا..... سسکیاں تھم گئیں تو ابا جی اٹھ کر بیٹھ گئے ..... مجھے اپنے پاس بٹھا لیا..... میرے آنسو پونچھے اور بولے..... میری بیٹی نے کیا دیکھا تھا ..... میں نے آہستہ آہستہ سسکتے ہوئے سارا منظر بیان کر دیا۔ ابا جی ..... سبحان اللہ ..... سبحان اللہ کہتے جاتے ..... اور ان کے آنسو بہتے جاتے اور جب انہوں نے اپنے اوپر قابو پا لیا..... تو میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے ..... بیٹا جی! آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ آپ کو مبارک ہو..... آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا جلوہ دکھایا ہے..... سبحان اللہ..... اس امانت کو سینے میں رکھنا ..... آپ نے زندگی میں بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ اللہ کی تائید ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گی..... اس کے بعد یہ ان کا معمول ہو گیا کہ مجھے اپنی لائبریری میں بٹھا کے مجھ سے سیرت النبی ﷺ کی کسی کتاب کا باب پڑھواتے..... اولیائے کرام کی کتابیں سنتے..... خود آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے میں پڑھتی رہتی..... کچھ سمجھ میں آتا کچھ عقل سے ماوریٰ ہو کر گذر جاتا..... یہ غالباً پنیری تھی ..... جو وہ لگا رہے تھے..... باغباں اللہ والا ہو تو گلزار مہک اٹھتا ہے..... ہمارے گھر کا ماحول صوفیانہ، شاعرانہ اور ادیبانہ تھا۔ امی جان بیگم نصرت عبدالرشید بہاول پور کی پہلی نعت گو صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ انہوں نے میرے ذمے ایک بہت ہی خوبصورت کام لگا رکھا تھا۔ پہلے تو مجھے خوش خطی سکھائی۔ تو پھر جب میں سکول سے واپس آتی تو اپنی نعتیں خوش خط کر کے لکھواتیں..... ننھی ننھی معصوم انگلیاں جب نعتِ رسول مقبول ﷺ بار بار لکھتیں تو ذہن کے اندر شوق اور لگن کی ایک لو جاگ اٹھتی۔ ہمارے گھر میں اکثر محافل میلاد منعقد ہوتی تھیں۔ امی جان مجھے سیرۃ النبی ﷺ کے حوالے سے چھوٹی چھوٹی تقریریں یاد کروایا کرتیں۔ اس طرح سوچ کا رخ بھی آپ ہی آپ گنبدِ خضریٰ اور غارِ حرا کی طرف ہوتا گیا۔ میں جب تعلیمی مراحل طے کرتی ہوئی تھرڈ ایئر میں پہنچی تو ہمارے کالج کو ایک ادارے کی جانب سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا کہ طالبات ''انسانِ کامل'' پر مضمون لکھ کر اس مقابلے میں شامل ہو سکتی ہیں۔ پرنسپل صاحبہ نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ میں اس مقابلے کے لیے مضمون لکھوں۔ میں نے لائبریری میں بیٹھنا شروع کر دیا اور وہاں موجود سیرت النبی ﷺ کی جس قدر جلدیں تھیں۔ ان کا مطالعہ

کر کے ایک مضمون لکھ کر اس مقابلے کے لیے بھیج دیا۔ میری خوش نصیبی کہ مجھے طالبات میں اول انعام ملا۔ (افسوس اس وقت نقل رکھنے کا نہ شعور تھا نہ کوئی ذریعہ ورنہ آج میں اس کی نقل پیش کر سکتی) اور پھر امید ہی کب تھی کہ میں انعام حاصل کر سکوں گی۔ مجھے انعام میں ''رحمت العالمین'' مؤلف قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان پوری کا ایک سیٹ بھیجا گیا۔ اپنے جہیز کی بہت ساری چیزوں کی طرح میں نے انعام میں ملنے والی کتب کپ اور میڈل اب تک سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ کتاب کے اوپر جو تحریر لکھی گئی تھی وہ اگرچہ اب دھندلا سی گئی ہے۔ مگر تا حال معدوم نہیں ہوئی۔ اس کی نقل پیش کرتی ہوں: باسمہٖ تعالیٰ

عزیز من! ''بمصطفٰے برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست'' ''انسانِ کامل'' پر آپ کی قلمی کاوش سے متاثر ہو کر ''رحمت اللعالمین'' کی جلدیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اس کتاب نے میری عملی زندگی کے نقش و نگار پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مجھے امید ہے اس انعام کو حاصل کرتے ہوئے آپ میری اس دلی خواہش کا احترام کریں گی کہ سال بھر میں کم از کم ایک مرتبہ اس کا ضرور مطالعہ کریں گی''۔ میں ہوں ایک ادنیٰ غلامِ رحمت اللعالمین ﷺ۔ محمد عبدالعزیز مشرقی

25-2-58

نہ تو میں کبھی اپنے نادیدہ محسن کے روبرو حاضر ہوئی نہ خود انعام لینے گئی کالج کی طرف سے مضامین بھجوائے گئے تھے اور پرنسپل صاحبہ کے ہاتھوں سے مبارکباد کے ساتھ میں نے یہ تحفہ وصول کر لیا تھا۔ دیکھا..... خوش ہوئی..... سنبھال کر رکھ لیا۔ جب کبھی کسی موقع پر سیرت النبی ﷺ پر تقریر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ان کتابوں سے استفادہ کر لیا۔ جانے کس طرح بعض لوگ دل سے دعا دے کر چلے جاتے ہیں کہ ہمارے وجدان میں کونپلیں سی پھوٹنے لگتی ہیں۔ والدین کی تربیت کا اثر تھا کہ محافل میلاد میں اکثر سیرت النبی ﷺ کے بارے میں تقاریر کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ اللہ کی طرف سے قلم کا تحفہ عطا ہوا تھا۔ ناول، افسانے، سفرنامے، ڈرامے، کالم، شاعری..... سب لکھنے کے باوجود، دل کے اندر ایک عارفانہ سی بیقراری رہنے لگی..... اور میں اسوۂ حسنہ پر لکھی ہوئی سب کتابیں جمع کرنے لگ گئی، مطالعہ کرنے لگ گئی..... جب کبھی حج اور عمرے کے لیے جاتی صحنِ حرم میں بیٹھ کر اذن مانگتی..... اور لکھنا شروع کر دیتی۔ لکھنے کا سلسلہ میں نے 1982ء میں شروع کر دیا تھا۔ لکھتی رہی اور روتی رہی..... میں جانتی ہوں ایسی کتابیں بزعمِ علم نہیں..... بزورِ عشق لکھی جا سکتی ہیں۔ عشاق کو بہت سی معافیاں بھی مل جاتی ہیں۔

بے خودی میں دل نے چاہا جس طرف سر رکھ دیا

بے خودی میں سب بجا ہے جس طرف سجدہ کریں۔ قرآنِ پاک تو ہر روز تواتر اور تسلی سے پڑھ لیتے ہیں۔ سیرت طیبہ لکھتے ہوئے قلم کیوں کانپ جاتا ہے..... دل کیوں لرزتا رہتا ہے..... اشک کیوں بہتے رہتے ہیں..... جان کیوں بلکتی رہتی ہے..... اعمال کیوں ڈراتے رہتے ہیں..... پھر بھی میں اپنے نہایت مہربان خدائے ذوالجلال کی ممنونِ احسان ہوں..... عمر کے اس حصے میں اس نے مجھے توفیق عطا فرمائی..... اذن عطا فرمایا..... حوصلہ عطا فرمایا..... روزِ قیامت میرے ہاتھ میں ایک سفارش نامہ ہوگا!! اہلِ خرد و اہلِ علم اس طرح سے دیکھیں کہ یہ ایک محبت کی کتاب ہے..... اور بس..... میری کم علمی، میری جہالت، میری نا یافت کو صرفِ نظر کریں۔ اور میری مزید راہنمائی کریں۔ اگلے ایڈیشن کے لیے..... اس کتاب کے بارے میں جن عظیم ہستیوں نے اپنی قیمتی آراء سے میری حوصلہ افزائی کی ہے میں ان کی بہت احسان مند ہوں۔ جناب حماد احمد لکھوی صاحب اور جناب ایس ایم ظفر صاحب اللہ انہیں درازیٔ عمر اور اجرِ کثیر عطا فرمائے، آمین۔ میری ڈھیروں دعاؤں کا حقدار عزیزم ڈاکٹر وقار ملک ہے..... جو ہر موقع پر میرا حوصلہ بڑھاتا رہا اور طباعت کے ضمن میں ہر گام میری راہنمائی کرتا رہا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اسے درازیٔ عمر عطا کرے اور دینی و دنیوی مراتب سے سرفراز کرے۔ آمین

علامہ عبدالستار عاصم کہنے کو پبلشر ہیں مگر حرف کی حُرمت، لفظ کی لذت اور فقرے کے فقر سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ ان کے دل میں بھی شمعِ رسالت کی روشنی، روشنائی بن کر صفحات کو حبیبِ رب جلیل کے ذکر پاک سے آراستہ کرنے اور شائع کرنے کی لگن میں رہتی ہے۔ یہ محض پبلشر نہیں ہیں گداگر ہیں در مصطفٰے ﷺ کے۔ ان کی شب و روز محنت و جانفشانی نے میرے کمزور حوصلوں کو توانائی بخشی اور آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ باری تعالیٰ انہیں ہمیشہ اس سے بڑھ کر توفیق اور توقیر عطا کرتا رہے۔ آمین میری دلی دعائیں ہیں اس کتاب کے کمپوزر، ایڈیٹنگ کرنے والوں کے لیے بائنڈر کے لیے اور اس پریس کے مالکان کے لیے جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کی..... جس جس مرحلے سے گزر کر محبت کی یہ کتاب شائع ہوئی اس مرحلے کے ہر فرد کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے..... آمین ثمہ آمین میں تصور میں سید الکونین ﷺ کے در کے باہر کھڑی ہوں..... سر جھکائے ہوئے..... ہاتھ باندھے ہوئے..... جہاں جہاں سے آپ ﷺ گذر کے جاتے تھے اس جگہ کی مٹی اپنے ماتھے پر لگائے ہوئے..... اپنے دوپٹے سے نعلین مبارک صاف کر رہی ہوں..... اور عرض کرتی جاتی ہوں.....

تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو! یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر.....! مدینہ کی گلیوں کی خاک کا اک ذرّہ

دُکھی کیوں ہو؟

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

اللہ والے کہتے ہیں:

دُکھ ایک کیفیت کا نام ہے جس کا تعلق عموماً آئندہ سے ہوتا ہے کل کیا ہوگا؟ دس سال بعد کیا ہوگا جس کا تعلق رب سے ہے اُسے آزمائش آ بھی جائے تو تکلیف ہوگی دُکھ نہیں ہوگا۔ مالک کو خالق ہی کو ساجن بنالیں تو اپنا سب کچھ بے دھڑک کہہ دیں

کوئی لگی لپٹی نا رکھیں کچھ دل کی کہیں کچھ مالک کی سن لیں مالک کی طرف جائیں تو وہ ایسا پروٹوکول دے گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔

دکھ بھی کئی طرح کے ہیں رونے کی بھی بہت سی وجوہات ہیں ہر کسی کا دکھ دوسرے سے علیحدہ ہے اور اکثر سوا بھی ہوتا ہے کسی کو روپے کم ہونے کا دکھ ہے کسی کو زیادہ ہونے کا دکھ آسائشیں ہوں تو بھی دکھ نہ ہوں تو ویسے ہی بندہ دکھی ہوتا ہی ہے اختیار پاس ہوں تو یوں بھی رنج والم ہی ہوتے ہیں ریڑھی والا بھی دکھی وزیراعظم بھی۔ چھابڑی والا بھی دکھی وزیراعلی بھی۔ مزدور بھی دکھی گورنر بھی سیلبرٹی بھی دکھی ناظرین بھی۔ ڈرائیور بھی دکھی سواریاں بھی ٹرانسپوٹر بھی غمگین ہے کنڈیکٹر بھی کہ اس کے تو معاشی ہی حالات ایسے ہیں اور پھر پیسے نہ ہوں تو بھی صبر کرنے والے کتنے ہیں شاید ایک فی صد بھی نہ ہوں پیسہ آ جائے تو خوش نہ ہونے والے کتنے ہیں؟ شاید ایک فی صد سے بھی کم۔ حضرت بابا جی بلھے شاہؒ اس سارے سینوریو کی منظر کشی یوں کرتے ہیں۔

؎ اب لگن لگی کہیہ کریئے
نہ جی سکیئے نہ مریئے
پلے پئی مصیبت بھاری
کوئی کرد ہماری کاری
کد تک دکھڑے کریئے
اب لگن لگی کیہہ کریئے

عموما اسی غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں اور یہی سوچتے ہیں کہ ہم نہ ہوئے تو کام کیسے ہوں گے فلاں کام کی جتنی سمجھ مجھے ہے دوسروں کو تو اس بارے علم ہی نہیں اک تجربہ کریں دکھوں سے نجات کا یہ مجرب نسخہ ہے مثال کے طور پر اپنا کوئی ایک غم کوئی ایک دکھ اللہ کی سپرد کریں اور دل سے دعا کریں کہ اے میرے مالک کارساز مابہ فکر کارما فکر مادر کارما آزار ما پر مجھے یقین ہے اب یہ میرا مسلہ نہیں تیرا ہے اور تو سبھی مخلوقات کے مسائل کو حل کرنے والی ذات ہے اب مجھے اس سارے مسئلے کو AYOID کرنا ہوگا حل تو تجھے کرنا ہے تو ہی کرے گا میں بہت کوشش کرلوں بڑا پریشان رہ لوں تو بھی کامیابی کو کائی امکان نہیں بظاہر ناکامی کے نقشوں میں بھی تو کامیابی نکال سکتا ہے قرآن مجید فرقان حمید میں تو یہی مثال پیش کی گئی۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو آگے دریائے نیل آ گیا پیچھے فرعون کی فوج آ گئی قرآن کریم فرماتا ہے آپؑ کے ساتھیوں نے گھبرا کر کہا

''اے موسیٰؑ ہم پکڑے گئے''

مگر اس کے بعد جو ہوا اک حقیقت ہے اس دکھ کو پریشانی کو اور ظاہری رنج والم کو اللہ جل شانہ نے کیسے کامیابی میں بدلا وہ تاریخ کا حصہ ہے فرعون کا ظاہری کروفر اسکی فوج اور وہ خود دریا میں غرق ہوا اور ہزاروں سال بعد بھی آج تک اس کی لاش اب بھی اہرام مصر میں ممی کے طور پر عبرت کا نشان بنی پڑی ہے۔

اس کائنات میں کوئی بھی اندھیرا ایسا نہیں جس کے بعد روشنی نہ ہو۔ رات تو خود سورج کے ابھرنے کی دلیل ہے اس لیئے وہ خوشیوں بھرے ادوار کے درمیانی حصے کو دکھ سے تعبیر کیا جاتا ہے رنج کے بعد راحت کا مل جانا یقینی ہے اور رنج بھی اللہ والوں کے لیئے تکلیف دہ تو ضرور ہوتا ہے پریشان کن نہیں اللہ کا سچا بندہ مشکل میں ہوتا ہے تو بھی دکھی نہیں ہوتا تکلیف ہونا اور بات ہے دکھ ہونا اور بات ہے تکلیف کے ساتھ گلہ شکایت شور شرابہ اور واویلا ہو تو اسے دکھ کہتے ہیں۔

تکلیف ہو اور دکھ نہ ہو یہی دکھوں سے نجات ہے اب یہ اک سوچ ہے اس سے آگے اک تعلق ہے اس سے آگے محبوب حقیقی ہے۔ فرائض کی ادائیگی شریعت ہے اس میں کچھ محبت ملا لیں تو اس کا نام تصوف ہے کچھ اور محبت ملا لیں تو اس سے تصوف کی حقیقت کچھ اور آشکار ہو جائے گی پھر خاموشی آئے گی شور شرابا پہلے کم ہوگا پھر ختم ہوگا اس کی جگہ سرمستی لے لے گی پھر دل سوزی آئے گی گریہ وزاری آئے گی پھر سوز وساز رومی دل میں گھر کر جائے گا اب اس سارے سفر میں زندگی کی اس پوری کہانی میں دکھ کا کہیں بھی گذر نہیں ہوگا اقبالؒ نے اسی لیئے اس کیفیت کی آرزو کرتے ہوئے فرمایا

؎ غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
اے بادبیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی، دل سوزی سرمستی و رعنائی

دکھ بھی زندگی کی FORMALITY ہے تکلیف بھی رنج بھی زخم بھی اکتاہٹ بھی درد بھی تھکن بھی مشکل بھی یہ سب اس زمرے میں آتے ہیں اب ان سب معاملات میں سے اک بات نکل جاتی ہے وہ ہے اللہ سے مانگنا اسکا تعلق اس سے بات چیت اس سے التجا اس کے سامنے آہ و بقا اس کے سامنے گریہ وزاری اپنی بھاگ دوڑ خجل خواری جاری رہتی ہے جہاں سے حالات اترتے ہیں اس طرف تو ہم عموماً جاتے ہی نہیں تو حالات کیسے صحیح ہونگے۔

میرا اپنے قارئین سے انہی تحریروں ہی کے ذریعے اک رشتہ بنا ہوا ہے جیسے میں نے دکھ اور تکلیف کے اندر فرق کی بات کی دکھی ہونا اور تکلیف

میں ہونا اس کے اندر موجود فرق کو ظاہر کیا اس طرح اک سوال عموماً خود سے یا دوسروں سے کیا جاتا ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے گا مجھ پر اللہ جل شانہ، راضی ہیں یا نہیں ؟ تو اس کا تھرمامیٹر بھی یہی ہے یعنی اس بات کا پتہ چلانے والا آلہ یہی ہے۔ اگر تو میں تکلیف کے اندر دکھی ہو جاؤں گلہ بھی کروں شکایت بھی شکوہ بھی کروں شور شرابہ بھی تو پھر معاذ اللہ میں اللہ پر راضی نہیں اور ظاہر ہے مہربان مالک بھی اعزاز و اکرام کرنے کے باوجود خوش تو نہیں رہے گا ہاں اپنے مسائل اپنی تکالیف اپنے اللہ کے سامنے بیان کریں تو غم ہلکے ہوں گے یہ دکھوں میں نہیں بدلیں گے اپنے دکھوں کو لوگوں کے سامنے بیان کریں گے تو ان میں اضافہ ہوگا لوگ اک ناکام شخص کی حیثیت سے جائیں گے اور ناکام شخص کا نقصان یہ بھی ہوتا ہے پھر ہر ایرا غیرا اسے مشورہ دیتا پھرتا ہے۔

دکھوں سے جان کب چھوٹے گی۔ جب صرف اللہ سے مانگیں گے اس سے اگلہ درجہ یہ ہے کہ مانگے بغیر دکھوں سے نجات مل جائے یعنی مانگے بغیر ملنے کی آرزو ہے تیسرا درجہ بعض اللہ والوں کے ہاں سے اور بعض اہل دل صاحب جمال لوگوں میں دیکھا کہ پھر ہر آرزو ہر چاہت ہر مانگ ہر التجا ہر دعا ہر خواہش ہر امنگ ہر انتظار ہر خطا ہر سزا، حتیٰ کہ ہر درد بے درد راستے سے ہٹ جاتا ہے دکھ ہوں بھی تو یاد ہی نہیں رہتے ان کی کسک بھی محسوس نہیں ہوتی کسی بھی رنج کی زندگی میں اہمیت ہی نہیں رہتی بس محبوب حقیقی کی یاد اس کی بات اس کی ذات اس کی بارگاہ میں گزری رات جب ہر غیر کو کر دے گی مات پھر دکھ تو یاد بھی نہیں رہیں گے موجود ہوں تو پھر دلداری میں غیر اہم ہو جائیں گے اس طرف بندے کی توجہ ہی نہیں جائے گی کیوں ؟ اس لیے کہ جہاں سے دکھ اترتے ہیں جہاں سے راحتیں آتی ہیں جب وہی اپنا بن گیا۔ جب اسی نے اپنا بنا لیا تو پھر رنج والم کی طرف دھیان ہی نہیں جائے گا۔ بندہ اگر مانگے تو کیا لے سکتا ہے؟ محبوب حقیقی کے خزانے اس کی کائناتیں اور جنتیں اتنی وسیع ہیں کہ بندہ آخر کو کتنا لے لے گا کس قدر لے لے گا اور کیا کچھ لے لے گا۔ سب کچھ جو وہ چاہتا ہے محبوب حقیقی اسے دان کر دے تو بھی کیا ملا؟ اگر وہ خود نہیں ملا تو کچھ بھی نہیں ملا اور اگر وہ خود مل گیا تو اور کچھ نہ بھی ملے تو یوں سمجھنا سب کچھ مل گیا یعنی دکھ درمیان سے نکل گئے پہلے پہل تو بندہ اللہ مانگتا ہے پھر اک تعلق بنا تو بندہ مانگنے کی بجائے اپنے محبوب حقیقی سے التجاء کرتا ہے کہ تو مل گیا تو بیماریوں کے دکھ پریشانیوں کی اکتاہٹ اپنوں کے حسد بیگانوں کے وار اور غموں کی یلغار سب کچھ درمیان سے ہٹ گیا دکھ پھر رہے ہی کب ہیں وہ تو تعلق کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے جس کے پاس آسودگی کے صحت کے خوشیوں کے سکون کے اطمینان کے مسکراہٹوں کے آسائشوں کے آرام کے خوشحالی کے خزانے ہیں جب وہ خود ہی مل گیا تو خوشحالی کی جگہ زبوں حالی کیسے آئے گی آسودگی کی جگہ بے چینی کب آئے گی مسکراہٹوں کی جگہ آہ و بقا کو در آنے کی مجال بھی نہ ہوگی محبت کا یہ جہاں اگر کسی کو نصیب ہو تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ تکلیف کس طرح آسائش میں ڈھل گئی آنسو کیسے مسکراہٹوں کا روپ دھار گئے۔ بے آرامی سکون کی چادر اوڑھ کر نہ جانے کب کی سو چکی۔

زندگی میں حزن وملال کی جگہ اطمینان کب لے لے گا جب ذہن بدلے گا دلچسپی بدلے گی زاویہ فکر بدلے گا تو نگاہ بدلے گی۔ نگاہ بدلے گی تو دن رات بدلیں گے۔ اعمال افکار کردار بدلیں گے۔ یہ سوچ کا فرق عادات واطوار میں بھی منتقل ہوتا ہے کتنی عجیب بات ہے کہ اللہ جل شانہ کو مانیں اور پریشان نہ ماننے والوں کی طرح رہیں۔ دکھ تو پھر قدم قدم پر ہر ہر گام پر ہر راہ پر ہر روش پر زندگی کی ہر گلی کے موڑ پر روح کا آزار بنیں گے دنیادار اس گلی کے موڑ پر دل برداشتہ ہو کر بیٹھ جائے گا۔ زندگی کو بوجھ سمجھے گا اس کے خاتمے پر بھی تیار ہو جائے گا۔ اللہ کے تعلق والا اسی موڑ پر لحظہ بھر رکے گا ان دکھوں پر خندہ زن ہوگا بڑے سکون سے یقین سے اطمینان سے محبت سے دل سے پاکیزگی سے اپنے محبوب حقیقی کی شان کو سامنے رکھ کر الحمد اللہ کہے گا اور زندگی کی راہوں پر اگلی گلی کا موڑ مڑ جائے گا پھر راہیں ، راہیں کہاں رہیں وہ تو شاہراہیں بن گئی کہ اس کے دل کی گلی پر محبت کا یقین کا اک ہولڈنگ آویزاں ہو گیا کہ وہ اس قدر دل آویز تھا جو دل پر آویزاں ہو گیا اس بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوگا

یہ دل کی گلی ہے یار کی گلی ہے یہ دکھوں اور بے یقینی کے لیے شارع عام نہیں دکھ مصیبت فقر فاقہ بیماری تنگدستی بے یقینی بے توکلی اور بے ایمانی کے لیئے اب یہ شارع عام نہیں رہی یہ ممنوعہ علاقہ بن گئی۔ غموں سے نجات کا یہ حتمی فارمولہ ہے اور تیر بہدف نسخہ ہے اللہ والوں کا آزمودہ ہے یقین نہ آئے تو ایک بار آزما کے دیکھ لیں یہ اس قدر سریع الاثر ہے کہ اس کی سچائی کا ہر آزمانے والے کو یقین آ جائے گا۔ یقین آ جائے تو نسخہ پر عمل آسان ہو جاتا ہے۔

اللہ والوں کی زندگی بھی بعض اوقات بظاہر برسر آزار نظر آتی ہے یہ ہماری سوچ کی ارزانی ہوتی ہے بعض اوقات اور محبت کرنے والوں کے آنسو محبوب کو بعض اوقات نہیں اکثر اوقات بڑے ہی خوبصورت لگتے ہیں سب کچھ اور بہت کچھ عطا کر دینے والا مالک بھی دعاؤں کی قبولیت میں تاخیر کر دیتا ہے کہ اسے دلدار کے سجدوں کی مٹھاس پسند ہے سجدوں کے سوز کو وہ پسند کرتا ہے کہ چاہنے والا اب نہ جانے کس کس پیرائے میں اپنے حقیقی محبوب کو یاد کرے گا الفاظ کی نہ جانے کون کون سی دیدہ زیب گل کاری اسی زبان سے ادا ہوگی۔

چاہت اور تڑپ کا اظہار کبھی کسی پیرائے میں ہوگا تو کبھی کسی حسن بیاں کا روپ سروپ دھارے گا مگر دیکھنے والا یہی سوچے گا کہ یہ طالب دکھی ہے رنجیدہ ہے اب اس طالب دعا کو اور ظاہری نظر سے دیکھنے والے کو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ بعض مانگنے والے پسند نہیں ہوتے اس لیئے سخی مالک بھی کچھ نہ کچھ دے کر ایسے مانگنے والے کو چلتا کر دیتا ہے۔ جو سچل مانگت ہے اس کے خوبصورت آنسو پیاری پیاری آہیں مالک کو بھی پیاری لگتی ہیں وہ چاہتا ہے کہ دعاؤں کا التجاؤں کا یہ پر کیف سلسلہ جاری وساری رہے۔

کسے آواز دوں

نازاوکاڑوی/لاہور

اس وقت میرے زیرِ مطالعہ ہے ملتان سے تعلق رکھنے والے پروفیسر قیصر ہاشمی کا غزل مجموعہ ''کسے آواز دوں'' ہاشمی صاحب اس سے قبل حالیہ مجموعہ کے ساتھ پانچ شعری مجموعے اپنے قارئین کو پیش کر کے داد تحسین وصول کر چکے ہیں تین غزلیہ ایک حمدیہ اور نعتیہ کے ساتھ ساتھ پنجابی شاعری کے شرینی سے لبالب، غزل، نظم اور گیتوں سے مزین ایک دلکش و حسین گلدستہ اپنے دوستوں کی ذہنی الماری میں سجا چکے ہیں۔ان کی شاعری روانی ہے حسن مضامین بھی، میں دلوں میں اُتر جانے والے خیالوں سے آراستہ خوبصورت اور یاد رہ جانے والے اشعار بھی۔ پیرانہ سالی میں بھی عشق کی جولانیاں آبشاروں کے پانیوں کی طرح اور کسی الھڑ مٹیار کی پائل کی جھنکار کی طرح غنایت بھی کانوں میں رس گھولتی ہے۔شاعر یا ادیب اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔دیدۂ بینا کے ساتھ معاشرے میں ہونے والے محرکات پر نا صرف نظر رکھنا ہے بل کہ اس کو اپنے الفاظ کے پہناوے کے ساتھ معاشرے کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے معاشرے میں ناہمواریوں اور ذہنی پستیوں اور ذہنی بیماریوں کی نشاندہی کے ساتھ ان کے سلجھاؤ کا بندوبست بھی کرتا ہے۔

فطرت کے حسین نظاروں سے جہاں خود لطف اندوز ہوتا ہے وہاں اپنے قاری کو بھی ان حسین لمحات میں برابر شریک کرتے ہوئے مہکتے پھولوں کی خوشبو اور گلشن میں کھلے ہوئے جا بجا رنگین گلوں کے دلکش نظاروں سے بھی دل و دماغ کو معطر کرنے میں ایک کلیدی کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔

وہ ایک پختہ کار شاعر ہیں لفظوں سے کھیلنے کے شاق کھلاڑی ہیں۔ان کی شاعری کا مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔اوزان و بحور کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نئے قوافی بھی اختراع کئے ہیں۔کلام میں بلا کی ندرت بھی ہے اور مضامین میں زبان کی سلاست بھی ہاشمی صاحب مسلسل سفر میں ہیں۔آنے والے وقتوں کے لئے زادِ راہ سنبھال رکھا ہے میری مراد ان کے آنے والے مجموعات میں سُنیں بھی تو، بحر افکار، آزمیشاں (پنجابی)، مناقبات حسین (حسینؓ کیا ہے، قیصر ہاشمی کے بارے ڈاکٹر مختار ظفر یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔

ان کی غزلیہ تخلیقات میں اس کا طرز احساس اور طرزِ اظہار بولتا ہے وہ قاری کو مسحور بھی کرتا ہے متفکر بھی۔اس کی شاعری قاری کے دل و دماغ میں اُتر کے رہ جاتی ہے اس کے اشعار میں تصنع ہے نہ بناوٹ جذبوں اور محسوسات کی حقیقی و فطری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ قیصر کا طرزِ اظہار قاری پر گہرا اور دور رس اثر چھوڑتا ہے۔

ڈاکٹر خان محمد ساجد اپنے تئیں ان کے بارے کیا تاثرات رکھتے ہیں آیئے دیکھتے ہیں۔

ان کی ذات محتاج تعارف نہیں۔میں ان سے بہت متاثر ہوں ان کی زندگی کے چند سال میرے ساتھ گزرے ہیں۔ ان کی روشنی میں مجھے ان کا تابناک ماضی جگمگ جگمگ کرتا نظر آتا ہے۔ان کا ہاتھ انسان کی نبض پر ہے اور انسانیت کو درپیش مختلف بیماریوں کا ان کو حد درجہ اِدراک ہے۔''کسے آواز دوں'' پڑھنے کے بعد چاہوں گا اپنی رائے کا اظہار کروں ہوسکتا ہے۔آپ اتفاق کریں ورنہ اختلاف برحق اور گنجائش موجود ہے۔

جیسا کہ شاعری کو سنوارنے میں ترکیبات کا استعمال اگرچہ لازمی نہیں بہت سے شاعروں میں سادہ پُرکاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ترکیبات سے مُراد شعروں میں اشارے، کنایئے، تشبیہات، صنعت تضاد اور تکرار لفظی ہے سو ہم دیکھتے میں ہاشمی صاحب نے ان لوازمات کا کہاں اور کیسے استعمال کیا ہے لفظ سے لفظ کشید کرنا بھی ایک فن ہے جیسے ''راہبر سے راہبری'' کو کیسے استعمال کیا ہے۔

حق تو یہ تھا راہبر کچھ راہبری کرتے مگر
وہ تو پیچ و خم سے پُر اک راستہ دکھلا گئے

میں زندان محبت کا ہوں زندانی بہت خوش ہوں
جفاؤں کے تسلسل سے طبیعت شاد رہتی ہے

قافیہ پیمائی بھی کسی شاعر کے مطالعے اور وسعت علم کا پتہ دیتی ہے۔ جسے کوئی جادوگر تاش کے پتوں سے جادوگری کے کمالات میں کمال رکھتا ہے ایسے ہی شاعر بھی لفظوں سے کھیلتے ہوئے اپنی علم و ہنر کے فن کو اپنی شاعری کے ذریعے جلا بخشتا ہے جیسے قافیہ کو نبھانے کیلئے موزوں اور خوبصورت قافیہ صحیح جگہ پر نگینہ کی طرح فٹ کرتا ہے دیکھیں اس شعر میں لفظ

(رُخ) کو صیغۂ جمع میں کیسے پرویا ہے۔

کب تک پسِ مژگاں چُھپے رہ سکتے ہیں آنسو
گہنا کے یہ رکھ دیں گے سبھی ماہِ رُخاں کو

تکرار وہ بھی اگر بے جا ہو تو طبیعت کو گراں گزرتی ہے لیکن شاعری ایک ایسا میدان ہے جہاں تکرارِ لفظی شعر کو خوبصورت بنانے میں ایک اہم جُز مانا جاتا ہے۔ بعض شعراء کے ہاں کمال کی تکرارِ لفظی کی امثال ملتی ہیں۔ یہاں ہاشمی صاحب نے بھی تکرارِ لفظی کی ترکیب استعمال کر کے اپنی شاعری کے حُسن کو دوبالا کیا ہے، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں

جستجو میں جن کے بھٹکے قریہ، قریہ، سُو بہ سُو
دیکھ کر ان کا وطیرہ قلب و جاں تھرّا گئے

حقیقت جاننا چاہیں تو بس یہ ہی حقیقت ہے
مجھے تم سے محبت ہے، محبت ہے، محبت ہے

تکرارِ لفظی یہ مراد ہرگز نہیں کہ لفظ بار بار استعمال کیا گیا ہو یا کیا جاتا ہے خوبی یہ ہے کہ ایک ہی لفظ کو طرح بدل کر استعمال کیا جائے جیسے ہاشمی صاحب نے لفظوں کو مختلف پیرائے میں ڈھالتے ہوئے اپنے شعروں میں لطف و چاشنی بھر دی ہے۔

خود داری رہے نہ رہے عرض ہو پوری
خودغرض میں سب پیکرِ ایثار میں کب لوگ

کسی کے دستِ تعاون کا انتظار نہ کر
تو دست و بازو کو اپنے ہی آزماتا جا

عُذر پہ عُذر مسلسل ہی کیے جاتے ہیں
صرف اور صرف تسلی ہی دیئے جاتے ہیں

مَر مَر جیا، میں جی کے مرا، یونہی روز و شب
قیصر یہ سانحہ تو کئی بار تھا ہوا

اکثر اوقات شعروں کا مفہوم یا انداز کسی دوسرے شاعر سے ٹکرا جاتا ہے یہ قطعی قصداً نہیں کیا جاتا یہ اتفاق محض اتفاق یا حسن اتفاق کہلاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ مطالعہ ہوتا ہے۔ مطالعہ ہی وسعتِ علم کا مرکزی سبب ہے یہاں ایک شعر کا حوالہ دینا چاہوں گا پروین شاکر نے کہا تھا

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
اک یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

لیکن قیصر ہاشمی کچھ یوں کہتے ہیں۔

وہ جا بھی چُکا چھوڑ کے کب کا مجھے قیصر
لوٹ آئے گا وہ پھر بھی مرے دِل کا یقین ہے

اب یہ شعر دیکھیں تکرارِ لفظی کے ساتھ ساتھ استعارہ بھی مستعمل ہوا ہے۔ یعنی ایک پنتھ دو کاج یا ایک ٹکٹ میں دو مزے جیسے وینیلا اور چاکلیٹ آئس کریم کے دو ذائقے

ہم کرتے حِنا بندی رہے خونِ جگر سے
پھیکا نہ پڑے رنگ کبھی اُس کی حِنا کا

ہر سُو ہے پرندوں کی کھڑی فوجِ ظفر موج
درپیش ہمیں معرکہ ہے کرب و بلا کا

ایک رنگ کا محاورہ کا بھی دیکھ لیتے ہیں

قُدرت کا قانون اٹل ہے
کاٹا وہی جو بویا ہوگا

جیسا ہر زبان میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں ہیں جنہیں برمحل معنی اخذ کرتے ہوئے لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے اب یہاں لفظ ''مستور'' عموماً عورت کے معنی میں مستعمل ہے۔ مگر انہوں نے بڑی مہارت کے ساتھ لفظ مستور، بمعنی ''چھپا ہوا، چھپی ہوئی'' کے معنوں میں باندھا ہے۔

مانا منافقت میں ہے مستور عافیت
پر کیا کریں ضمیر ابھی تک مرا نہیں

جی حضوری میں ہی تھی مستور خیر و عافیت
اختلافِ رائے پر خنجر بکف سب آ گئے

انہوں نے اپنی شاعری میں دقیق الفاظ سے کسی طبیب کی ہدایت کے مطابق حقیقی پرہیز کرتے ہوئے سہل ممتنع سے کام لیا ہے۔ سادہ اور سلیس الفاظ قاری کو بور ہونے سے بچاتے ہی نہیں شاعری کا پُورا پُورا لُطف مہیا کرتے ہیں۔ ہر غزل اپنا رنگ اور لہجہ ترنگ کے ساتھ پھولوں سی تازگی شبنمی تراوٹ لئے شاطِ جاں کو معطر اور مسخر کرتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں متنوع مضامین باندھے اور خیالات کو عمیق نظروں سے دیکھتے ہوئے جہاں محبُوب کے لب و رُخسار اور بے اعتنائی اور بے وفائی کا ذکر کیا ہے وہاں معاشرے میں ناپید اخلاقیات امن و آشتی کے عدم وجود کو بھی اپنی شاعری میں بیان کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں قیصر ہاشمی ہمیں پڑھنے کے لئے مزید نئے ادب سے نواز کر شکریہ کا موقع دیں گے اور اس دُعا کے ساتھ کہ اللہ کرے زورِ سُخن اور زیادہ اور اس مجموعہ ''کسے آواز دوں'' کی ڈھیر مُبارک۔

اسیر عابد بطور مترجم ''دیوانِ غالب''

ثاقب تبسم ثاقب/علی پور چٹھہ

ثقافت کے بارے میں یہ بات مسلمہ ہے کہ یہ افراد کی معاشرت، جبلت اور طرزِ زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔فکر وخیال کی جلوہ آرائی سے تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے احساس و ادراک میں مدد ملتی ہے۔ثقافتی اقدار کی بالیدگی جہاں قلبی وجدان، ذہنی سکون اور اطمینان کا وسیلہ ثابت ہوتی ہے وہاں اس کے اعجاز سے روحانی سوز وسرور کی لازوال دولت بھی میسر آتی ہے۔تراجم کے ذریعے ثقافتی میراث کی منتقلی کا افادیت سے لبریز عمل سدا جاری رہتا ہے۔زبان میں مضامین، موضوعات اور خیالات کی تونگری، تخلیقی فعالیت کی ہمہ گیری اور جذبہ شوق کی بے کرانی تراجم کی مرہونِ منت ہے۔مترجم جب قلم تھام کر ترجمے پر مائل ہوتا ہے تو وہ ثقافتی اقدار کی ترسیل کے لیے اس بات کا التزام کرتا ہے کہ اس کے ترجمے پر قاری کو پختہ یقین ہو۔وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اگر کسی تخلیق یا ترجمے پر قاری کا اعتماد اور یقین متزلزل ہو جائے تو سارا عمل سرابوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور ساری محنت غارت چلی جاتی ہے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ایک زمین کے پودے کو دوسری اجنبی زمین میں لگانے کے مترادف ہے۔کسی نقاد نے کہا ہے کہ کسی شعری تجربے کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا چائے کے باغات کو میدانی علاقے میں منتقل کرنے کے برابر ہے۔ناسازگار جغرافیائی ماحول میں نباتات کے حُسنِ نمو کو ''روحِ نمو'' کے فطری مزاج میں تبدیلی لائے بغیر برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔پنجابی تہذیب وثقافت کے شیدائی اسیر عابد نے یہ ناممکن کام ممکن کر دکھایا۔انھوں نے تراجم کو ثقافتی ارتقاء کے لئے ناگزیر سمجھتے ہوئے دنیا کو غالب کی عظمتِ فکر سے روشناس کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے دیوانِ غالب کا جو منظوم پنجابی ترجمہ پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

پروفیسر اسیر عابد کا نام اردو اور پنجابی زبان و ادب کے منظوم ترجمے کی عظیم روایت کی حیثیت سے مسلم ہے۔شعروادب ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔حمد و نعت سے لے کر سلام، منقبت و غزل تک اور شخصی مراثی سے احباب کے حضور خراجِ تحسین تک انھوں نے کئی صحرا عبور کیے لیکن ان کی اصل وجہ شہرت منظوم ترجمہ نگاری ہے۔دیوانِ غالب، بالِ جبریل اور قصیدہ بُردہ شریف کا پنجابی میں منظوم ترجمہ، کلامِ بلھے شاہ کا اردو میں نثری ترجمہ اور ہیر وارث شاہ کا اردو میں منظوم ترجمہ، اُن کے ایسے کارنامے ہیں جو شاید رہتی دنیا تک اپنی مثال آپ رہیں گے۔بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پروفیسر اسیر عابد، جن کا اصل نام غلام رسول تھا، کا تعلق ضلع گوجرانوالہ کی زرخیز ادبی سرزمین علی پور چٹھہ سے ہے۔ان کے گاؤں کا نام سید نگر ہے۔ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ دیوان غالب کا منظوم پنجابی ترجمہ ہے۔اسے پہلی بار مجلسِ ترقی ادب لاہور نے مئی 1987 میں شائع کیا جو اس نایاب ہے۔یہ کتاب اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی سمیت بھارتی پنجاب کی یونیورسٹیوں میں بھی بے حد مقبول ہوئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسیر عابد نے غالب کے اشعار کا ترجمہ کرنے کا حق ادا کر دیا۔انہوں نے اصل شعر کے قریب رہ کے لفظوں کو پنجابی روپ دیا اور بحریں وہی رہنے دیں جو مرزا غالب نے استعمال کی ہیں۔فن کے قدردان اس خوبی کو بخوبی جانتے ہیں۔

کسی بھی تحریر یا بیان کا ابلاغ اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک اُسے اُسی زبان میں پیش نہ کیا جائے جو اُس کے قارئین یا سامعین کی مستعمل زبان ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام طبع زاد تحریریں بالعموم اپنے اپنے ملک یا خطے کی مروج زبانوں میں ہی سامنے آئیں۔لیکن ایک زبان کے علم وفن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا شعور بھی انسان کو عطا ہوا۔ عُرفِ عام میں اس شعور کو ترجمہ نگاری کا فن کہا جاتا ہے۔ایک ترجمہ نگار کے لیے دونوں زبانوں کا ماہر ہونا ضروری ہے، بلکہ صرف ہر دو زبانوں پر عبور ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے: دونوں کے بولنے والوں کی تہذیبوں، ثقافتوں، محاورات اور ضرب الامثال تک سے اسے واقفیت ہو، کیونکہ جب تک وہ دونوں زبانوں کا مزاج آشنا نہیں ہوتا، اُس وقت تک وہ ترجمہ نگاری کے فرض سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔دنیا جہاں کے کلاسیکی ادب میں سے غزل کا ترجمہ مشکل کام سمجھا جاتا ہے اور اساتذہ غزل میں غالب کے کلام کا ترجمہ سب سے زیادہ مشکل اور بعضوں کے نزدیک ناموافق تصور کیا جاتا ہے کیونکہ غالب کے کلام کا فن اور غالب کا مزاج کسی سے لگا نہیں کھاتا۔اس لیے کلامِ غالب کی ترجمہ نگاری سراسر گھاٹے کا سودا ہے یہی وجہ ہے کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سمیت دیگر صاحبانِ علم بھی اس میں الجھ کے رہ گئے۔لیکن پروفیسر اسیر عابد نے دیوانِ غالب کی ترجمہ نگاری کمال مہارت سے نبھائی ہے۔

غالب دنیا کے ان چند عظیم شعراء کی صف کے رکنِ اعظم ہیں کہ جن کے بغیر شعری ادب کی بلندیوں اور عظمتوں کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔غالب نہ صرف اردو شاعری کی معراج ہیں بلکہ وہ اردو زبان کی تہذیب کی اعلیٰ ترین صورت بھی ہیں۔لہٰذا غالب سے آشنائی اردو زبان کی تہذیب کی اعلیٰ ترین صورت سے آشنائی ہے۔غالب صاحبِ ایجاد شاعر تھے اور فکر کی بلندیوں

کے ساتھ ساتھ انہیں زبان کے فنی استعمال پر بھی خالقانہ قدرت حاصل تھی۔ یہ غالب کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو فارسی کے مقابلے پہ لا کھڑا کیا اور یہاں تک کہہ ڈالا کہ:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی
گُفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

(کیویں ریختہ ڈنگدا فارسی نوں جے کوئی پچھے
اسیر پنجابیاں نوں
اک وار بٹھا کے کول اوہنوں غالب خان دے
بول سُنا کہ اِنج)

ایسے دعوے کے بعد غالب کی شاعری کو کسی بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل شاعری کے کمالات کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی امکانی وسعتوں اور عظمتوں سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔ پروفیسر اسیر عابد نے دیوانِ غالب کا منظوم پنجابی ترجمہ قریباً چودہ برس کی ایسی کامل ریاضت سے کیا کہ یہ ترجمہ بذاتِ خود ایک تخلیق کا روپ اختیار کر گیا ہے، اسی لیے تو احمد ندیم قاسمی اس کو ترجمے کا اعجاز قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں، ''اگر غالب زندہ ہوتا اور اُسے پنجابی کی شُد بُد ہوتی تو ترجمہ سُن کر اسیر عابد کو سینے سے لگا لیتا۔'' احمد ندیم قاسمی نے جن اشعار کو مثال کے طور پر پیش کیا، وہ ملاحظہ کیجیے:

غالب کہتے ہیں:

قطع کیجیے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

اب اسیر عابد کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

ساڈے نالوں لگ لگا توڑیں نہ
کُجھ وی نئیں تے بھلیا اِٹ کھڑکا سہی
اسی کدی وی اگّوں سِر نہ چُکاں گے
بے پرواہیاں تیرا لکھ وسیبا سہی

غالب کی ایک معروف غزل کے چند اشعار اور ان کا ترجمہ دیکھیے، اک لذتِ بامعنی محسوس ہوگی۔۔

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اب اسیر عابد کے تخلیقی ترجمے کی گرفت ملاحظہ ہو:

پکی گل اے، مرنا اک دن متھیا اے
نیندر کاہنوں راتیں جھلی آوندی نئیں
اگے دل دے حالوں ہاسڑ آوندی سی
ہون کسے وی گلوں بھیڑی آوندی نئیں

اور یہ شعر۔۔۔

منیا! متھے ٹیکیاں اجر ودھیرے نیں
ایسے پاسے طبع کپتی آوندی نئیں

ان اشعار میں اِٹ کھڑکا، جھلی، بھیڑی اور کپتی ایسے الفاظ سے غالب کے اشعار کا مفہوم انتہائی گہرائیوں تک واضح ہو جاتا ہے بلکہ اسیر عابد کے ان اضافوں نے غالب کے اشعار کی تفہیم میں بھی اضافے کیے ہیں۔ میں تو یہ بھی مانتا ہوں کہ غالب کے سہلِ ممتنع کو اسیر عابد نے اپنی بے پناہ مہارت سے ایسا بانکپن بخشا ہے کہ اس کی رعنائیوں اور شوخیوں پہ دل ہار نے کی کیفیت باندھ دی ہے۔ مثلاً اس شعر کا تذکرہ نہ کرنا تو زیادتی ہوگی۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اسیر عابد نے داخلیت کی اس فضا کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ دل بے اختیار اش اش کر اُٹھتا ہے:

کنڈھے وَل آساں دی بیڑی آوندی نئیں
اصلوں کوئی شکل وی نظری آوندی نئیں

پروفیسر اسیر عابد نے غالب کے رنگ کو اس طرح رنگ دیا ہے کہ اس کہکشاں کے بھی تارے اپنی چمک دمک کے حوالے سے اپنی پائندگی کے ارفع مقام تک پہنچے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے غالب فہمی کو ایسے انداز میں اجاگر کیا ہے کہ غالب کی اردو شاعری، پنجابی کا چولا پہن کر سرزمینِ پنجاب کی چیز لگنے لگی ہے۔ غالب کی شاعری کا سارا رکھ رکھاؤ اور وقار ملحوظ رکھا۔ ترجمے کے دوران اگر اسیر عابد نے کہیں اجتہاد سے کام بھی لیا تو رنگِ غالب کی شدت کم نہیں ہوئی بلکہ لَو دیتی ہوئی اور بھی گھنیری ہوگئی۔ احمد ندیم قاسمی کا ایک دیکھیے، جس سے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ رہے گی کہ اسیر عابد نے دیوانِ غالب کو کیسا برتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اسیر عابد نے کسی ایک مقام پر بھی غالب کے ساتھ زیادتی کا ارتکاب نہیں کیا اور دیوانِ غالب کا ایک ایسا منظوم پنجابی ترجمہ وجود میں آیا جو آئندہ صدیوں تک ترجمے کا معیار قرار دیا جاتا رہے گا۔''

مرزا غالب کو عام طور پر مشکل شاعر کہا جاتا ہے۔ دراصل وہ مرزا کی جدت طرازی ہے جس کے شوق نے انہیں معمولی باتوں کی نئی نئی تشبیہات، استعارات اور کنایات وضع کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے جس باریک بینی اور تجزیاتی ادراک سے شعر کہے اس کے باعث وہ زیادہ مشکل پسند اور مشکل گو شاعر نظر آتے ہیں۔ اس مشکل گوئی کے باعث غالب کے مترجمین کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہوگئیں۔ اسیر عابد نے کلامِ غالب کی روح میں اُتر کر اُس کے حقیقی معانی کو تلاش کیا اور اس کے بالمقابل پنجابی زبان کے الفاظ کو اس ہنرمندی سے برتا کہ غالب کی نکتہ آفرینیوں سے لے کر تراکیب بندیوں تک ہر شعر تخلیقی کٹھالی سے گزر کر کُندن بن کر یوں سامنے آتا ہے کہ مفہومِ غالب سے لے کر ابلاغِ غالب تک کے مراحل بتدریج طے ہونے لگتے ہیں۔ غالب کی تراکیب کو سمجھنا اور ان کے بالمقابل پنجابی تراکیب کا ڈھونڈ نا برتنا ایک ایسے مشاق اور ہنرمند شاعر کی طلب کرتا ہے جو ان تراکیب کو پنجابی کا حقیقی

رُوپ بخش سکے۔ اسیر عابد کے ترجمے کے بعد تراکیب کا یہ مسلہ بخوبی حل ہو جاتا ہے۔ غالب جس طرح اردوئے معلیٰ میں تراکیب سازی کا نیا جہان آباد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی طرح اسیر عابد بھی پنجابی زبان میں نئی تراکیب اُساری کی مضبوط روایت کا سنگِ میل بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ انہوں نے دیوان غالب کے ترجمے میں اپنی اس ہنر مندی کے بے شمار نئے جہان تخلیق کیے۔ ذرا غور فرمایئے کہ ''آتشِ زیر پا'' کو ''پیراں ہیٹھ چواتیاں'' کہا گیا، ''جذبہ بے اختیار'' کو ''اتھری سدھر'' سے سنوارا گیا، ''فتنہ خُو'' سے ''آخر جوگا'' کو ملایا گیا اور ''نالہ دل'' کو ''ہُوک دِلے دی'' اور ''آتشِ پنہاں'' کو ''گھیاں اگاں'' سے جوڑا گیا۔ ایسی شاندار ترکیب سازی کے ساتھ ساتھ انہوں نے شعر کا جمالیاتی حسن، بانکپن اور نزاکتِ طبعی کا بھی پورا خیال رکھا۔ انہوں نے معنی کے ابلاغ کے لیے شعر کے حسن کو مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ اس کے لیے انہوں نے عروضی بحروں اور لسانی حوالوں سے نئے تجربے کر کے پنجابی زبان کی بے مثال وُسعت کے نئے امکانات کی بھی خبر دی۔ اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذت درد
کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

ترجمہ دیکھیے:

سدھراں پھنڈ یا دل وی اپنا ہیسی درد سواداں لنگر
جنھے جنا جنا چھیا اونا اونا رجیا ڈِٹھا

اسی طرح یہ شعر اور اس کا ترجمہ بھی اعلیٰ ہے:

جلوہ گُل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو یاں
رواں مژگاں چشمِ تر سے خون ناب تھا

ترجمہ:

اودھر پھُلاں دی چھاں پاروں دیوے ندیاں وچ تردے سن
ایدھر پلکاں دے چشمے توں رت خاص جگر دی جاری سی

اسیر عابد نے مرزا غالب کی مشکل پسندی اور تغزل کو ایک دلربائی سے اپنایا۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر خالد احمد کا ایک پنجابی جملہ آپ کی سماعتوں کی نذر کروں۔ جملہ سُنیئے: ''جے غالب دی پنجابی لکھدا تے انج ای لکھدا۔'' میں سمجھتا ہوں کہ خالد احمد کا یہ جملہ نہ صرف اسیر عابد کو شاندار خراج تحسین ہے بلکہ ان کے کام کا اعتراف بھی ہے۔

غالب کے شعری جہان میں ان کی گرمئ محفل کی لذت بھی پورے اہتمام کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اسیر عابد نے ان لمحوں کے مناظر کو یوں سمیٹا ہے کہ روحِ غالب ان کے ترجموں میں بھی رواں دکھائی دیتی ہے اور لذتِ گفتارِ غالب، اس کا تو نشہ ہمیں اسیر عابد کے ترجمے میں پورے جوبن پر یوں دکھائی دیتا ہے کہ حسنِ ترنمِ غالب سے ہماری سماعتیں مشک بار ہونے لگتی ہیں۔ غالب کی سُنیئے:

رات کے وقت مئے پیئے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یُوں
مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح؟
دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یُوں

اب دیکھیئے کہ اسیر عابد کا ترجمہ کیا کہتا ہے:

ویلا رات دا ہووے تے پیتی ہوئے سنگت نال رقیب دے کیتی ہوئے
ربا آون دی ایدھر نیتی ہوئے، رباجیہا نہ چن چڑھا کہ انج
مینوں پچھیا یار نے دس تے سہی کیویں ہوش اُڈاریاں مار جاندے
ترس کھا کے میری مدہوشیاں تے، کولوں اُڈ کے لنگھی ہوا کہ انج

مرزا غالب نے تلمیحات کے استعمال سے جا بجا اپنے دیوان کو مرصع کیا ہے۔ انہوں نے جہاں بھی کسی تلمیح کو برتا ہے، وہ پورا واقعہ اپنے مکمل تاریخی پس منظر کے ساتھ ہمارے آئینہ خانہ تصور میں یوں آبستا ہے کہ ہم خود اس واقعے کو اپنی چشمِ تصور سے اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ گویا ہم بھی شریکِ محفل ہیں اور یہ واقعہ پورے محاکات کے ساتھ ہماری نگہ و گوشی سے دید بازی اور سمع خراشی کرتے ہوئے دھیرے دھیرے گزر رہا ہے۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش مگر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

اسیر عابد نے اس خوب صورت اور نادر واقعے کو اس طرح سے موزونیتِ طبع غالب سے پنجابی میں ترجمہ کیا ہے کہ ہم بندی خانے، آنکھوں اور انتظار سے بھی گزرتے ہیں اور حضرت یوسف کی زیارت کے لمحے مصر کی حسین عورتوں کو اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں کاٹتے، ان سے لہو کو ٹپکتے اور پھر زلیخا کو اس لمحے کی شادمانی اور مسرت کی حقیقی لذت لیتے بھی دیکھتے ہیں۔ ترجمے کا یہ حسن ایک طرف غالب کے شعر کی عظمت کا اقرار ہے تو دوسری طرف اسیر عابد کے فنِ ترجمہ کاری کا ایسا اظہار ہے جو فقط انہی کے قلم کو زیبا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ بھی اس لذت میں میرے ساتھ شامل ہو جائیں:

بھانویں بندی خانے سارئی یعقوبؑ نہ یوسفؑ دی
پر کالی کوٹھی دی کندھے جھرنے اکھیاں ہو گئیاں
سارے سڑن رقیباں توں پر سینے ٹھنڈ زلیخا دے
مصری ناراں تک یوسفؑ توں بکیاں بکیاں ہو گئیاں

اس ''بکیاں بکیاں'' کی داد تو اسیر عابد زنانِ مصر سے بھی لے سکتے ہیں۔

کلامِ غالب میں ہمیں جا بجا محاورات اور ضرب الامثال کا ایک پُرشور دریا لہریں لیتا دکھائی دیتا ہے جس کی بنا پر بلا شک و شبہ غالب اپنے معاصرین میں سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی بنا پر غالب ایک مخصوص تہذیب کے داعی اور دلدادہ بھی نظر آتے ہیں۔ اسیر عابد نے ان محاورات اور ضرب الامثال کو کچھ اس طرح سے پنجابی میں ترجمہ کیا ہے کہ ہم پنجابی رنگ و آہنگ کا واضح فرق بھی دیکھ سکتے ہیں اور اسیر عابد کی ہنر مندی کا شوخ رنگ بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ یہ رنگ غالب کے رنگ سے اتنا گھلا ہوا ہے کہ ہم کوئی خطِ امتیاز تو نہیں کھینچ پاتے البتہ اسیر عابد کے فن کی جادوگری میں کھو جاتے ہیں اور غالب کی تہذیب ہمیں پنجابی میں انتہائی مانوس لگتی ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر تیرا وقتِ سفر یاد آیا!

ترجمہ:

آخر پیڑاں حالی دُھوخ نہ کڈھی سی
فیر تیرے فُر پین دا ویلا یاد پیا

ہوا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
ورنہ شہر میں غالب کی آبرُو کیا ہے؟

ترجمہ:

شاہ دی بہنی بہند اے، تاں ای اڈی نئیں سُولگدی
نہیں تے دسو شہر اندر غالب دی واہ واہ کیہ اے؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

ترجمہ :

جدوں تیرے بناں ربا! ڈھول نئیں وجدا
فیر طوطیاں نقاریاں دا رولا کیہ اے؟

غالب کی شاعری میں ان کا تصورِ حسن و عشق بڑی خوب صورتی کے ساتھ جلوہ آراء ہے۔ ان کے احساسات اور جذبات کی آئینہ داری عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک رسائی حاصل کر کے ایک فلسفیانہ اندازِ فکر میں ڈھل جاتی ہے۔ اسیر عابد غالب کے عشقیہ اشعار کو جب پنجابی کا لباس پہناتے ہیں تو ان کی حسن بیانی سے انحراف دکھائی نہیں دیتا بلکہ ان کے اشعار کی خماری اور لذت بھی دو آتشہ ہو کر ہمارے احساسات پر وارد ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

دہر جُز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ترجمہ:

جگ تے کجھ وی نئیں معشوق دیاں نیں سبھے لِشکاں
اپنا آپ جے حسن نہ دیہندا اسیں وی کتھے ہیساں

اسیر عابد نے غالب کی شوخی اور بے ساختگی کو اس فنکاری سے سنبھالا ہے کہ اردو معلّٰی سے اردو محلّہ کے پنجابی ڈھنگ تک ہمیں ایک ہی لَے دکھائی دیتی ہے۔ شعر کے تیور اور رنگ ڈھنگ میں غالب کا مخصوص اسلوب اپنے پورے جوبن کے ساتھ یوں رقصاں ہے کہ اسیر عابد، غالب میں کہیں گم ہو جاتے ہیں اور پھر دکھائی نہیں دیتے۔ ترجمے کا یہ اعجاز اسیر عابد کے ترجمے میں ہی موجود ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کو پاؤں

ترجمہ:

رات کسے دے سُفنے اندر فُر کے آیا لگدا اے
اج اینویں نئیں مٹھیاں بھر دا جند ملو کے پیراں نوں

ان اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسیر عابد نے پنجاب کے مخصوص روایتی طرزِ زندگی اور بولی ٹھولی کو اس طرح سے دیوانِ غالب کے ترجمے میں سمویا ہے کہ پنجابی کلاسیکی روایت اور دہلی کی نکسالی زبان، محاورہ بندی اور طرزِ زندگی رَل مِل گئی ہے۔ اسیر عابد کا یہ ترجمہ پنجابی زبان و ادب کے ماتھے کا جھومر بن کر دیوانِ غالب کی دمک اور بھی آبدار بنا رہا ہے۔ اسیر عابد کے فن کی حقیقی قدر شناسی بشیر منذر کے اس خراجِ تحسین سے واضح ہو جاتی ہے، وہ کہتے ہیں:

''اسیر عابد نے غالب جیہے شاعر نوں ہتھ پا کے اگلیاں پچھلیاں کسراں کڈھ دتیاں نیں تے سارے دھونے دھو دِتے نیں۔ اوہنے گج وج کے غالب نوں دس دتا اے کہ جناب، ابھی کجھ لوگ باقی ہیں جہاں میں، جیہڑے پنجابی وچ تہاڈے ورگے شعر لکھ سکدے نیں۔ میرا خیال اے کہ واقعی جے غالب دے کنیں ایہ شعر پے جان تے اوہنوں ضرور شک ہو جائے کہ شاید ایہ میں ای لکھے نیں۔ مینوں اِنج لگدا اے غالب نال بہت وڈھا دھرو ہویا اے۔ ایہ ترجمہ کر کے اسیر عابد نے غالب دے پورے دیوان تے مَل مار لئی اے۔

ہُن لوکی آکھیا کرن گے اسیر عابد دا دیوانِ غالب پڑھیا اے، لکھیا سُوتے سوہنا لکھیا سُو۔''

بشیر منذر کے اس خراجِ تحسین کی گواہی تو یہ شعر بھی دیتا ہے، ملاحظہ کیجیے کہ اس شعر میں اسیر عابد نے غالب کو پنجابی ادراک اور شعور کی سطح کے کتنا قریب لے آئے ہیں:

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبُو کیا ہے؟

ترجمہ:

پنج ست مٹ شراب جے دِسے، پیندا چنگا لگناں
جھجر، واہڑی، گاگر، چھنا، گھڑا، پیالہ کیہ اے؟

پروفیسر اسیر عابد نے دیوانِ غالب کا ترجمہ اتنی علمی شان و شوکت کے ساتھ کیا ہے کہ یہ پنجابی زبان پر ان کی بے پناہ دسترس کی ایک عظیم یادگار کی حیثیت سے انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ بطورِ مجموعی یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ اسیر عابد دیوانِ غالب کے ترجمے میں اپنی اُن تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں جو ایک اچھے ترجمے کے لیے لازمی و ابدی ہیں اور جن کے بغیر ترجمے کا اعجاز وجود میں نہیں آتا۔ غالب ایسی شخصیت کی شاعری کے اسرار و رموز کو پہلے خود سمجھنا، پھر خود کو اُن کے زمانے اور ماحول تک لے جا کر اُن کے فکری محاسن اور فنی پیمانوں کو جانچنا، پھر لفظی ترجمے سے خود کو بچانا، معنوی اعتبار سے ترجمانی کی سعی کرنا اور پھر لفظوں کو موسیقیت کی میزان میں تولنا فن کی معراج ہے جو اسیر عابد کے حصّے میں آئی ہے۔ اس ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسیر عابد نے ترجمے کو محض لفظوں کی تبدیلی نہیں سمجھا بلکہ ایک تہذیب سے جنم لینے والے تخلیقی عمل کو ایک دوسری تہذیب کے اندر بدل دیا ہے اسی لیے یہ ترجمہ تہذیبوں کے مابین مکالمے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہ ترجمہ دیوانِ غالب کے شانہ بشانہ پورے وقار کے ساتھ کھڑا پنجابی زبان و ادب کا مان بڑھاتا رہے گا اور مستقبل میں کلامِ غالب کے پنجابی ترجمے کے لیے اعلیٰ معیار بن کر قائم رہے گا۔

شاعری

لتا جی کے لیے ایک نظم

گم سم گم سم ساز پڑے ہیں سر کی رانی چلی گئی
اُجڑ گئی رنگوں کی دنیا
روٹھ گئی پھولوں سے خوشبو
خشک ہوا سنگیت کا دریا
کرکے دنیا کو دیوانہ وہ دیوانی چلی گئی

جب جب بھی وہ تان لگاتی
وقت کا پہیہ رک جاتا اور
سرگم اُس میں گم ہو جاتی
اُتر گئے راگوں کے چہرے لے کی جوانی چلی گئی

جیسے ہوں بچپن کے میت
جیون کے ہر درد کا درماں
مرہم جیسے اُس کے گیت
سات سروں کا دریا تو ہے اس کی روانی چلی گئی
خوابوں کے در کھولنے والی
بکھر گئی وہ گل آواز
کانوں میں رس گھولنے والی
ڈوب گیا وہ صبح کا تارا، شام سہانی چلی گئی

اُس کے گیتوں کی مہکار
ایک سی آتی جاتی تھی
ملکوں کی سرحد کے پار
مست کیا ہر دل کو جس نے وہ مستانی چلی گئی

گم سم گم سم ساز پڑے ہیں سر کی رانی چلی گئی

امجد اسلام امجد/ لاہور

ارژنگ کے ٹائٹل کے پرندے کے نام

گیتوں میں لپک ان کی، محفل میں پرندے ہیں
ہر ذہن کی رونق ہیں، دل دل میں پرندے ہیں
ایسے تو یہ نظارے، دیکھے نہ کبھی پہلے
ارژنگ ہے پھولوں میں جھلمل میں پرندے ہیں
اب دشت میں نغموں کے، اسرار لگن کے ہیں
دیکھا تو نظر آیا، مخمل میں پرندے ہیں
اک طرفہ قرینے سے، اپنی سی وہ کر دیکھیں
دریا میں شکارے ہیں، ساحل میں پرندے ہیں
آغاز میں یکساں ہیں، انجام میں یکساں ہیں
رستے میں پرندے ہیں، منزل میں پرندے ہیں
احساس میں رکھتے ہیں، ہر لحظہ حصول اپنا
یہ کہنا ہے لاحاصل، حاصل میں پرندے ہیں
اک اور ہرا جنگل، اک اور بیاباں ہے
کس سمت اُڑیں ثاقب، مشکل میں پرندے ہیں

آصف ثاقب/ بوئی ہزارہ

اُن کی آنکھوں کی ساری گہرائی
میرے اشعار میں نہیں آئی
اس طرح تو نہیں بچھڑنا تھا
پھر تری یاد بھی نہیں آئی
آؤ باتیں سہولتیں مل کر
آؤ کرتے ہیں عالم آرائی
نوحۂ وقت تھی غزل میری
گانے والوں نے یوں نہیں گائی
جھوٹی قسمیں ہزار کھائی ہیں
تیرے سر کی قسم نہیں کھائی

وہ خریدار نے مسل ڈالی
جو کلی شاخ پر نہ مرجھائی
جانے وہ کیا چلے گئے کہہ کر
دل نے تسکین پھر نہیں پائی
کل جو رہبر تھے آج رہزن ہیں
وقت کی بات ہے مرے بھائی
وہ مرے دل کے ہیں مکیں نصرتؔ
اب تو وہ بھی نہیں ہیں ہر جائی

نصرت صدیقی/ فیصل آباد

عمر دھویں سے پیلی ہوگی
یہ لکڑی بھی گیلی ہوگی
موت مرا معمول رہے گا
کوئی کہاں تبدیلی ہوگی
پھیل رہا ہے سرد رویہ
رات بڑی برفیلی ہوگی
ہجر کا اپنا ایک نشہ ہے
غم کی شام نشیلی ہوگی
میں نے سگریٹ سلگانا ہے
ماچس میں اک تیلی ہوگی
غالب کے قہوہ خانے میں
بات ذرا تفصیلی ہوگی
اچھی طرح سے بال سکھا لے
تیز ہوا سردیلی ہوگی
ہفتوں بعد ہے نکلا سورج
دھوپ بہت نوکیلی ہوگی

کال آئی ہے امریکہ سے
موسم میں تبدیلی ہوگی
گرم دسمبر کے پہلو میں
جسم کی آگ لجیلی ہوگی
نوٹ پیانو کے سن سن کر
رم جھم اور سریلی ہوگی
دن بھی ہوگا آگ بگولا
رات بھی کالی نیلی ہوگی
اک اتوار ملے گی مجھ سے
اور بڑی شرمیلی ہوگی
شعر بنانا چھوڑ دے لیکن
یہ منصور بخیلی ہوگی

منصور آفاق/لاہور

کوئی نالاں ہے، کوئی دمساز ہے
ہر کسی کا منفرد انداز ہے
ہر کسی کی خوبیاں ہیں مختلف
کوئی خوش دل، کوئی خوش آواز ہے
چہچہانے کو ہے فخر عندلیب
ساری محفل گوش بر آواز ہے
لگ رہے ہیں آپ کچھ محتاط سے
گفتگو میں جس قدر ایجاز ہے
معتقد ہیں اُس کے عشاقِ کرام
حُسن ایسا صاحب اعجاز ہے
اب نیا کنبہ ہے جو ہمسائے میں
اُن کی اک بیٹی سراپا ناز ہے
مجھ سے مت پوچھو جنوں کی داستاں
میرے سینے میں سلگتا راز ہے
آج ملنے کی فضا موزوں نہیں
کچھ طبیعت بھی مری ناساز ہے
مرگِ جاں کو خاتمہ سمجھو نہیں
یہ تو اک انجام کا آغاز ہے
ماند پڑ جاتی ہے اپنی ہر صدا
''معذرت'' بھی اک شکستہ ساز ہے
اب پر پرواز ہے کچھ ناتواں
اب جوانی سی کہاں پرواز ہے
شاذ ہی ہوں گے سخنور ذی وقار
جیسے راشدؔ شہر میں ممتاز ہے
کوچۂ خوباں ہے راشدؔ ضوفشاں
کوئی مہرو ہے کوئی مہناز ہے

ممتاز راشدؔ لاہوری/لاہور

آگ جلے

آرہے ہیں وہ دن گل بدن جب تجھے
پارسائی کا پچھتاوا ڈسنے لگے گا
ترے جسم و جاں پر اُترنے لگے گا
عذابوں کی صورت
کچلنے لگے گا تری روح کو
روح جس نے بدن کو ٹھکانا کیا

حسرتا وہ بدن جس نے ممنوعہ لذت نہ چکھی کبھی
ہائے وہ جسم جس نے کسی کو نہ چھپ کر چھوا
جس کو روکا گیا اور ڈانٹا گیا
حیف اس جسم پر
جس کا انکار کرتے جوانی گئی

آ جوانی کے دریا پہ باندھی گئی بندشیں توڑ دیں
آج خود سے بغاوت کریں اور دنیا کا رخ موڑ دیں
پارسائی کی مٹکی یہیں پھوڑ دیں
ورنہ نزدیک ہیں
آرہے ہیں وہ دن گل بدن جب تجھے
پارسائی کا پچھتاوا ڈسنے لگے گا

شہزاد نیر/لاہور

میں جو کہتا ہوں مجھے تجھ سے محبت نہیں ہے
اس کا مطلب ہے ابھی تیری ضرورت نہیں ہے
کھوکھلے ڈھانچوں پہ ہوتا ہے چٹانوں کا گماں
حالانکہ ایک بھی مضبوط عمارت نہیں ہے
اجنبی چھپ پہ تھکے ہارے ہوئے بیٹھے ہیں
ان پرندوں کو اُڑانے کی اجازت نہیں ہے
کھا کے پتھر میں دُعائیں کہاں دے سکتا ہوں
عشق میں میری ابھی اتنی ریاضت نہیں ہے
پاؤں میں آبلے، چہرے پہ تھکن کے آثار
مرے ہونٹوں پہ مگر حرفِ شکایت نہیں ہے
جسے دیکھو وہی ملتا ہے تمہیں جھک کے ظہورؔ
پھر بھی کہتے ہو کہ میری کوئی عزت نہیں ہے

ظہور چوہان/بہاولپور

خود کو حیرت سے تک رہا ہوں میں
آج خود میں جھلک رہا ہوں میں
یہ جو شب کو چمک رہا ہوں میں
روشنی کا فلک رہا ہوں میں
آؤ بیگانگی کی سیر کریں
تیری قربت سے تھک رہا ہوں میں
آ مجھے تھامنے کو آگے آ
ہجر سے اب چھلک رہا ہوں میں

اپنے موسم کے انتظار میں گم
شاخِ امکاں پہ پک رہا ہوں میں
وہ گھڑی گر چکی کلائی سے
ہاتھ پھر کیوں جھٹک رہا ہوں میں؟
اپنے لوگوں نے ہاتھ تھاما ہے
اور پھر بھی بھٹک رہا ہوں میں

اسحاق وردگ/پشاور

کچھ کہوں یا کہ میں خاموش رہوں لکھتا ہوں
اب تو ہنستے ہوئے بھی سوزِ دروں لکھتا ہوں
اس سے بڑھ کر کوئی سمجھوتا نہیں ہے ممکن
خوف لکھتا ہوں تو معنی میں سکوں لکھتا ہوں
گم شدہ عشق وضاحت کے لیے آتا ہے
دل کی دیوار پہ اشعارِ جنوں لکھتا ہوں
ہجو لکھتا ہوں خرابے کی خرابی پہ مگر
اس کا عنوان ''خرابے کا فسوں'' لکھتا ہوں
وہ جو تحریر میں ہوتا نہیں سب پڑھتے ہیں
پسِ دیوار کے ہر راز کو یوں لکھتا ہوں
جتنے ختمے ہیں وہ بنتے ہیں سوالی لہجے
مسکراتے ہوئے جب حالِ زبوں لکھتا ہوں
کون؟ کب؟ کیسے؟ کہاں؟ کیا؟ کے سوالات پہ اب
میرے مالک! میں فقط کن فیکوں لکھتا ہوں
بس یہی سوچ کے ہر روز اُٹھاتا ہوں قلم
کیا خبر کل میں رہوں یا نہ رہوں لکھتا ہوں
بات کہہ دینا تو پنجرے سے اُڑانا ہے پرند
اس سے پہلے کہ میں ہر بات کہوں لکھتا ہوں

اسحاق وردگ/پشاور

مصلحت سے ہم نہ آئے صحن میں
تھے کئی مانوس چہرے صحن میں
یہ مرے معصوم بچے صحن میں
جس طرح گل ہیں مہکتے صحن میں
گھر کی ہر دیوار میں ہیں در کئی
بن گئے ہیں کتنے رستے صحن میں
خوب صورت خواب گاہوں کے یہاں
دیکھتے ہیں لوگ سپنے صحن میں
اُٹھ گئی ہیں اب تو دیواریں بہت
اور اتنے ہی دریچے صحن میں
گھر کی دیواریں شکستہ ہو گئیں
پھر اُتر آئے ہیں سائے صحن میں
ظلمتوں کے سائے منڈلانے لگے
کیوں خدا جانے دمکتے صحن میں
اے خدا اس کو سدا آباد رکھ
دوڑتے پھرتے ہیں بچے صحن میں
ہے خزاں کی زد میں چاہت کا شجر
ہر طرف بکھرے ہیں پتے صحن میں
کون یہ مہمان گھر آیا ندیمؔ
چاندنی اُتری ہوئی ہے صحن میں
سن رہا ہوں جانے کب سے میں ندیمؔ
کیسے کیسے سخت لہجے صحن میں

ریاض ندیم نیازی/سی

چاند چمکتا رہتا ہے

شدت غم سے چاند بوجھل ہے
کوہ آرارات پر چڑھ کر دیکھو
کون تارہ ٹوٹ گیا لگتا ہے
کوئی کشتی تو اس کی آنکھ سے اوجھل ہے
تاروں پہ پھول اُگتے رہتے ہیں
اپنی ہی خوشبو سے وہ سلگتے رہتے ہیں
سینوں میں ٹھنڈک لانے کو
وہ چاندنی کی کرنیں چگتے رہتے ہیں
پھر تارے تو ٹوٹتے رہتے ہیں
اور پھولوں کے مقدر بھی
تاروں کی آتش بازی میں
پھوٹتے رہتے ہیں
ہاں لیکن اپنوں کے اوجھل ہونے سے
دل زخمی کے بوجھل ہونے سے
تارے پھر بھی ٹوٹتے رہتے ہیں
اور چاند چمکتا رہتا ہے

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

پنچھی جا کر دور پلٹنا بھول گئے
آنگن کے سب پھول مہکنا بھول گئے
پلکوں پر اک تتلی آ کر بیٹھ گئی
پھر ہم اپنی آنکھ جھپکنا بھول گئے
خوشبو اپنی چھوڑ گئے ہو پاس مرے
کیا کیا تم سامان میں رکھنا بھول گئے
ہنس دیتے ہو آنکھ چرا کر آج بھی تم
لیکن اب وہ گال دہکنا بھول گئے
آنکھوں کو ترسیل لہو کی تم سے تھی
جانے کیوں تم یار دھڑکنا بھول گئے
نمبر ہے تبدیل مگر تم فون پہ یار
لہجے کی جھنکار بدلنا بھول گئے
میسج میں بس پاگل لکھ کر بھیج دیا
کتنا کس کے پیار میں لکھنا بھول گئے

عاطف جاوید عاطف/لاہور

جلوہ نما ہے یا رتوِ گوشہ نشیں ہوں میں
کچھ سوچ کر ہی سامنے آتا نہیں ہوں میں
اہلِ نظر کے فیض سے کایا پلٹ گئی
ممکن نہیں ہوتا جہاں، ہوتا وہیں ہوں میں
تھا کون؟ جس کی چاپ نے چونکا دیا مجھے
مدت سے اس کو دیکھنے بیٹھا یہیں ہوں میں
جو کچھ عدو نے کر دیا اس کا نہیں ہے غم
اک رازداں کی چال پہ اندوہگیں ہوں میں
اب بھی وفورِ شوق میں بنتی ہے اک شبیہ
ہر دور میں ہی حسن کے زیرِ نگیں ہوں میں
بسملؔ دکھا کے ہاتھ وہ چلتے بنے مگر
ان کی ادائے خاص پہ خندہ جبیں ہوں میں

وحید بسملؔ/ آزاد کشمیر

شکست دل کی وحشت کو گوارا کر لیا میں نے
تجھے پا کر رہوں گی استخارا کر لیا میں نے
بڑی اُلجھن تھی دل میں اک اشارا کر لیا میں نے
وہ نہ سمجھا تو گھبرا کر دوبارا کر لیا میں نے
سمندر کب کسی بھی چیز کو خاطر میں لاتا ہے
یہ دیکھا تو سمندر سے کنارا کر لیا میں نے
دلِ مرحوم کی تدفین کی ہے گھر کی چوکھٹ میں
گزارا ہی تو کرنا تھا گزارا کر لیا میں نے
جب اُس ظالم نے سارے بے سہاروں کو صدا دے دی
انا کو چھوڑ خود کو بے سہارا کر لیا میں نے
امرؔ فاقہ، قناعت اور رضا کے مہر تاباں کو
حیاتِ جاوداں کا استعارا کر لیا میں نے

عرفانہ امرؔ/ گوجرانوالہ

چاند فلک سے آن گرا ہے آنگن میں
جانے تو کیا ڈھونڈ رہا ہے آنگن میں
اہل خانہ کی خاطر ہے سایہ اب
سوکھا پودا ہرا ہوا ہے آنگن میں
اُن کا خط ہے سچ مچ ایک کبوتر جو
اُڑتے اُڑتے پھینک گیا ہے آنگن میں
دیکھ رہا ہے چھت کا منظر آنکھوں سے
یوں تو وہ بے جان کھڑا ہے آنگن میں
چلتے چلتے اُن کی یادوں کا جھونکا
آ کر کیسے ناچ رہا ہے آنگن میں
اُس نے اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ بھی
آج تصورؔ پھینک دیا ہے آنگن میں

تصور اقبال/ پنڈی گھیب ضلع اٹک

کشتیاں

اک نیا منجدھار میں تھی
لہروں کی روانی
چین کہاں لینے دیتی ہے
تیز ہوا کے شور میں
مجھے برہا کا گیت سنائی نہیں دیا
درد کی سرحد پر کھڑے سوالوں نے
نطق و لب پہ گویا زنجیر ڈال دی
حُسن کرشمہ ساز نے یہ کب دیکھا
کہ آئنے دھندلا چکے ہیں
مدتوں سے ذہن کی دہلیز پہ رکھے
ایک چہرے نے
اپنی سمت تبدیل نہیں کی
ہاتھوں میں پانیوں کا پھول لیے
وہ ساحل پر منتظر ہے
یہ جانے بغیر
کہ آنے والا وقت کے
بگولوں میں بکھر چکا ہے
زندگی کی آخری کہانی کا
موڑ آ چکا
اپنا چہرہ لے جاؤ
میں نے کاغذ کی کشتیاں
بنانی چھوڑ دی ہیں

آسناتھ کنول/ لاہور

فلک پہ چھانے لگی ہے گھٹا اُداسی کی
کہیں سے آنے لگی ہے صدا اُداسی کی
بتا رہی ہے مجھے اردگرد خاموشی
کہ سر شام چلے گی ہوا اُداسی کی
خزاں رسیدہ چمن میں بہار بھی آئی
پر ایک پیڑ رہی میں رہا اُداسی کی
سفید بال جواں جھریوں کو دیکھ کے تو
میں حیرتی کھڑا تکتا رہا اُداسی کی
سحر میں لے رہی ہے خاص و عام کو اپنے
صدائے باز گشت بارہا اُداسی کی
سرمئی شام مرے ساتھ جل دیا بن کے
یا مجھے آج کوئی حد بتا اُداسی کی
دروں سے دیپؔ صدا آ رہی ہے رونے کی
ہے کون دیکھ تو چلمن اُٹھا اُداسی کی

شہزاد دیپؔ/ جھنگ

جاپان کا اُردو بازار

عامر بن علی/ جاپان

کتاب روزمرہ کا اہم جزو ہونا چاہیے۔ مگر پاکستان کے اچھے اچھے اور معتبر لکھاریوں کی کتابیں بھی پانچ سو یا ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں، جو اگر بک جائیں تو پبلشر کتاب کو کامیاب شمار کرتا ہے۔ ہمارے ہاں کتاب کا رواج نہ ہونے کی بے شمار وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو کتاب پڑھنے کا شوق ہے ان کے معاشی حالات عام طور پر کتاب خریدنے کی اجازت نہیں دیتے اور جن کے معاشی حالات اچھے ہیں انہیں عموماً مطالعہ کا شوق نہیں ہوتا۔ ہمارے ہمسایہ ملک ایران میں ہر گھر کے اندر جس طرح باورچی خانہ ضروری ہوتا ہے اسی طرح لائبریری یا کم از کم کتابوں کی الماری گھر کا ضروری حصّہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر دیوان حافظ گھر کی لائبریری میں پہلے سے موجود ہے اور بازار میں اس کا کوئی اور نیا اور بہتر ایڈیشن آ گیا ہے تو گھر کا کوئی نہ کوئی فرد اسے خرید لائے گا۔ یہ بات المیے سے کم نہیں کہ لاہور میں جہاں کبھی پرائیویٹ لائبریریاں ہوا کرتی تھیں، اب وہاں دودھ دہی کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ حالانکہ جس طرح جسم کو اچھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دماغ کو بھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ مطالعے سے ہی فراہم کی جاسکتی ہے۔

بعض دوستوں کا خیال یہ ہے کہ کتاب تو ایک بہانہ ہے اصل میں یہ لوگ آپس میں نظر ملانے سے کتراتے ہیں لیکن اس نقطۂ نظر کی نفی اس بات سے ہو جاتی ہے کہ یہاں سینکڑوں میں شائع ہونے والی ہر کتاب بیرون ملک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے۔ کسی بھی ٹرین یا بس میں سوار ہو جائیں، ہر دوسرے چوتھے آدمی کے ہاتھ میں کتاب نظر آئے گی۔ جو وہاں کتاب کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔ اگر ہم صرف جاپان میں چھپنے والے اخبارات و میگزین اور کتابوں کی مجموعی تعداد دیکھیں تو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہر آدمی اوسطاً روزانہ ایک کتاب یا اخبار ضرور خریدتا ہے۔

قارئین کو بتاتے چلیں کہ دنیا میں کتابوں کی فروخت کا سب سے بڑا مرکز ٹوکیو میں واقع ہے۔ جس میں دس لاکھ سے زائد عنوانات پر کتابیں موجود ہیں۔ ٹوکیو کے علاقے ''کھاندا'' کو جاپان کا اردو بازار کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس بازار کی منفرد بات یہ ہے کہ یہاں پرانی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی بے شمار دوکانیں ہیں۔ حال ہی میں سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی فروخت میں اضافے کے لئے ایک تنظیم کتب فروشوں نے تشکیل دی ہے جس کے زیر اہتمام ایک کتابچہ چھاپا گیا ہے جو کہ پورے ملک میں ہر بکسٹال پر دستیاب ہے۔ جس میں ان تمام کتب فروشوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق دستیاب کتب کی بنیاد پر ان دکانوں کو تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کوشش کا مقصد نوجوان نسل کو بھی کتاب کی طرف مائل کرنا ہے جو کہ کتاب بینی اور شائع شدہ مواد سے دور ہوتی جارہی ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ نوجوان نسل بھی مطالعہ سے دور نہیں ہو رہی بلکہ صرف شائع شدہ مواد سے اس کی رغبت ویسی نہیں جیسی کہ روایتی طور پر اس معاشرے کا خاصہ رہی ہے۔ نئی نسل میں مطالعے کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال بڑھتا جارہا ہے اور کمپیوٹر سکرین پر کتابیں پڑھنے کا رواج اس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ درجنوں کمپنیاں آپ کو کمپیوٹر سکرین پر پسندیدہ کتابیں مہیا کردیتی ہیں۔ ہر کتاب متعلقہ گاہک کے نام پر ہی خریدی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے کمپیوٹر پر منتقل یا ڈیجیٹل کیا جاتا ہے۔ جس کا یہ کمپنیاں معقول معاوضہ وصول کرتی ہیں۔ جب سے امریکہ کی ایک کمپنی نے ڈیجیٹل پیڈ متعارف کروایا ہے تب سے کمپیوٹر پر کتابیں فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کاروبار چمک اٹھا ہے۔ ایک کمپنی نے جولائی میں دس ہزار کتابوں کو ڈیجیٹل کر کے گاہکوں کو فراہم کیا۔ اگست کے مہینے میں یہ تعداد پندرہ ہزار کو پہنچ گئی اور ستمبر میں پچیس ہزار کتابوں کے لوگوں نے اس کمپنی کی مدد سے ڈیجیٹل کروایا۔ تاکہ وہ انہیں کمپیوٹر سکرین پر یا پھر سمارٹ فون پر پڑھ سکیں۔ کتاب کو ڈیجیٹل کر کے یہ کمپنیاں گاہک کو ڈی وی ڈی دے دیتی ہیں۔

اس وقت پبلشرز اور ان کمپنیوں کے درمیان کاپی رائٹ کے حوالے سے قانونی جنگ چل رہی ہے جو کہ خاصی دلچسپ ہے۔ لیکن اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اس لئے ہم ٹوکیو کے سیکنڈ ہینڈ کتب فروشوں کی بات کرتے ہیں جن کا کتابچہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ جس میں مسکراتے ہوئے بیسیوں کتب فروشوں کی تصاویر اور تعارف موجود ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ ''ہم کتب فروش کا ہاتھ میں ڈسٹر پکڑے تند مزاج بوڑھے والا امیج تبدیل کرنا چاہتے ہیں'' گزشتہ شام ایک قصبے میں واقع ایسی ہی کتابوں کی دوکان پر کم وبیش دو سو افراد موجود تھے۔ یہ منظر پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں کہ یہاں کی زندگی کے معمولات میں شامل ہے، لیکن اس بار دل میں خیال آیا کہ کتاب سے دوستی کی یہ روایت اگر ہم لوگ بھی اپنا لیں تو معاشرے کی بہت ساری خرابیاں دور ہوسکتی ہیں اور بے شمار آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

جوڑوں کے درد

امجد محمود چشتی/

فرشتوں کے لکھے پہ پکڑے جانے والے انسان کو عرش پہ بنے جوڑوں کی وساطت سے دنیا میں لانے کا اہتمام ہوا۔ پھر انسانی جسم میں تین سو ساٹھ جوڑوں کی موجودگی نے جوڑوں کی اصطلاح کو انسان سے لازم کر دیا۔ یوں انسان کے اندر کے جوڑوں اور عرش پہ بنے جوڑوں کے اپنے اپنے درد متعارف ہوئے۔ پر یہاں فقط اک دوجے کے لباس قرار دیئے گئے جوڑوں کے گفتہ، شگفتہ و نا گفتہ دردوں کا تذکرہ ہے۔ جوڑوں کے درد کی تاریخ انسانی تخلیق سے جُڑی ہے۔ اسی درد کے موجب انسان جنت بدر ہوا اور یہی درد زمین پر پہلے قتل کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا۔ وقت گزرا تو بنی نوع انسانیت میں وٹامن شی، وٹامن ''ہی'' اور پروٹین کی کمی شدت اختیار کر گئی اور ان کا محض ایک دوسرے پہ گزارا مشکل ہونے لگا۔ لہٰذا شرعی و غیر شرعی کثیر الازواجی اور دیگر رشتوں کے ساتھ منہ بولی بیویوں کا رواج بھی عام ہو گیا۔ جوڑوں کی اقسام دیکھیں تو ان میں مثالی جوڑے، چھچھورے جوڑے، بن بتوڑے جوڑے، گھگھو گھوڑے جوڑے، توڑے مروڑے جوڑے، لمبے چوڑے جوڑے اور بھگوڑے جوڑے شامل ہیں اور ان میں ہمیشہ جوڑ توڑ جاری رہتا ہے۔ بلحاظ قسمت یہ جوڑے پہلے، دوسرے، چوتھے اور ساتویں آسمان پہ بنائے جاتے ہیں۔ کبھی جوڑے اپنے اپنے حصّے کی خوشیاں اور درد ساتھ لاتے ہیں اور ان کے معاشقے قیدِ شریعت سے دوچار ہو کر کثرتِ اطفالی کو فروغ دیتے ہیں۔ بالی عمر کے جوڑے نظر بازوں کی عمیق نظروں کے باعث غیر محفوظ شمار ہوتے ہیں لیکن خستہ سال و حال جوڑے محفوظ مگر غیر محظوظ ہو جاتے ہیں۔ ہر جوڑا ہر روز ایک دن پرانا ہو جاتا ہے۔ بڑھتی عمر سر پر بھاری گزرتی ہے اور مرد کا سر باہر سے جبکہ عورت کا اندر سے خالی ہونے لگتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ بچپن میں یہ درد نا ہونے کے برابر پر پچپن میں سوا ہو جاتے ہیں کیونکہ اس دور میں رومانس کیلئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ ازمنہ قدیم میں گھر کا پانی لانے کی ذمہ داری گوریوں کے کندھوں پر تھی لیکن مکافاتِ عمل کے تحت آج پنگھٹ کی بجائے فلٹر سے پانی لانے کا کام مردوں کے سر ہے۔ اچھی صورت بری شئے ہے کیونکہ جو ڈالے، بری نظر ہی ڈالے۔ کوئی ''غیر'' اگر زیادہ اچھی لگنے لگے تو اس پہ بری نظر پارساؤں پر بھی واجب ٹھہر جاتی ہے۔ یوں جوڑوں کے یک طرفہ، دو طرفہ یا سہ طرفہ درد اٹھنے کے سلسلے دراز ہونے لگتے ہیں اور شادی کے کچھ عرصہ بعد اکثر دو کی بجائے تین افراد کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ گویا میاں بیوی گاڑی نہیں رکشہ بن جاتے ہیں۔ پھر،، کفو،، پہ پورا نہ اترنے اور مزاجوں کے تفاوت کے نزلے بھی جوڑوں کے اعضائے رئیسہ پر گرتے ہیں۔ ایک فریق میر کے سرہانے تو دوسرا توپ کے دہانے پہ کچھ کہنے کہلانے کا خوگر ہوتا ہے۔ یہ بھی دیکھا سنا ہے کہ میاں بیوی خوش رہ سکتے ہیں بشرطیکہ میاں کسی اور کا اور بیوی بھی کسی اور کی ہو۔ بیویوں کو شوہروں کی معلومات کم مگر بیواؤں کو ان کے اصل ٹھکانوں کا وثوق سے علم ہوتا ہے۔ ویسے بھی پہلی بیوی سے ٹوٹ کر محبت کا رواج کہاں؟۔ یوسفی کے مطابق شاہ جہان نے بھی آٹھویں بیوی کیلئے محل بنوایا۔ عرب ممالک میں یک زوجیے کو مسکین سمجھا جاتا ہے۔ دیکھا دیکھی اپنے ہاں کا یک زوجیہ بھی اس درد کی شدت محسوس کرتے ہوئے شرح خاوندگی میں اضافے کی،، ہڑک،، میں مبتلا رہتا ہے۔ شاعر نے خوب کہا ہے میں تو اہل ہوں کسی اور کا میری اہلیہ کوئی اور ہے۔۔ میں ردیفِ مصرعۂ عشق ہوں میرا قافیہ کوئی اور ہے۔ کسی تجربے کی تلاش میں میرا عقدِ ثانوی ہو گیا۔ میری اہلیہ کو خبر نہیں میری اہلیہ کوئی اور ہے۔ بنی نوع مردانیت میں کچھ ایسے مردِ آزاد بھی ہیں کہ پیری میں رال ٹپکانے سے باز نہیں آتے اور نہ ہی سگی یا سوتیلی بیویوں میں فرق کرتے ہیں۔ ہمسائے سے زیادہ ہمسائی کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ یوسفی نے سچ کہا تھا کہ سیانا مرد نظریں نیچی اور نیت خراب رکھتا ہے۔ کنوارے ان دردوں سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ کنوارے پن کی ایک دن کی زندگی شادی شدہ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ تاہم ان میں سے کچھ آؤٹ سٹینڈنگ کی تلاش میں خود ''آؤٹ'' سٹینڈنگ ہو جاتے ہیں۔ ان کے اپنے ڈھیروں درد ہیں جیسے تیرے وعدے اگر وفا ہوتے۔ ہم مجازی سہی، خدا ہوتے۔ البتہ ماہرین مجنوں، رانجھا، مرزا، پنوں اور ماہیوال کے دردوں کی طبی، اخلاقی اور شرعی نوعیت وضع کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔ ان کے علاوہ جوڑوں کے درد کے اسباب میں ساس کا وجود ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اسی طرح گھر دامادی اور زن مریدی بھی ان دردوں کی شدت بڑھاتی ہیں۔ زن مریدوں میں حسن ظن اور حسنِ زن کے موجزن ہونے کے موجب،، تھلے لگنے،، کی خداداد صلاحیت پائی جاتی ہے جو اسے معاشرے میں شرم کے مقام پر فائز کرتی ہے۔ ان کے دلوں میں خوفِ الٰہی و اہلیہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ ایسے شوہر حقِ شوہریت اور،، بیگم ڈانٹ کام،، میں فرمانبردارانہ مہارتوں کے بل بوتے پر چھپے خصم نکلتے ہیں۔ گلِ نوخیز اختر کے مطابق خواتین کو شکوہ رہتا ہے کہ بھوک نا لگنے کے باوجود ان کا وزن بڑھتا جا رہا ہے۔ سسرال نے آج تک بہو تسلیم نہیں کیا، اوپر سے شناختی کارڈ پر غلط تاریخ پیدائش لکھوا دی ہے۔ میری قسمت میں سکون کہاں؟ میرے سارے بھائی رن مرید ہیں۔ خالو کے بیٹے کے رشتے میں مجھ سے مشورہ تک نہیں کیا گیا۔ شوہر شاپنگ پہ نہیں لے جاتا۔ یہ کوئی زندگی ہے۔ شکیل ہی ٹھیک تھا۔ ادھر حضرات کے بھی نرالے درد ہیں جیسے، پاؤں دبوانا کہاں کی شرافت ہے۔ سارے تولیے ایک ہی دن دھونا ضروری ہیں؟۔ پھر بستر کی چادر سے منہ بھی صاف نہیں کرنے دیتی۔ موبائل سے کون سی ویڈیو پہلے ڈیلیٹ کی جائے۔ گھر میں کوئی چیز وقت پر نہیں ملتی۔ لڑکیوں کو انکل کہتے شرم نہیں آتی۔ شیو آج کی جائے یا پرسوں؟۔ وغیرہ۔ غرض یہ دنیا کے تمام خطوں میں پایا جانے والا سب سے بڑا انسانی ازدواجی عارضہ ہے جس کے وقتی مداوے بھلے عقدِ ثانی، دولت کی روانی اور من مانی سہی مگر جُز مرگ شائد ہی کوئی ابدی علاج ہو۔ مشہور زمانہ و زنانہ ڈرامہ،، میرے پاس تم ہو کے انجام سے بھی یہی پیغام ملا کہ مرد عورت سے بچھڑ جانے سے ہرگز نہیں بلکہ اس کے واپس آنے کے خدشے سے مر جاتا ہے۔ تاہم آخر میں بنی نوع نسوانیت کی عظمت میں اعتراف لازم ہے کہ مرد کی طرح عورت کے قلب و نظر پر بھی قفل نہیں ہوتے مگر جب بھی دلوں اور گھروں کے ٹوٹنے کی نوبت آ پہنچے تو عورت ہی ہے جو فطری صلاحیتوں سے اپنی خواہشات قربان کر کے خود اور خود سے جُڑے بہت سے افراد کو بکھرنے اور ٹوٹنے سے بچا لیتی ہے۔

داد بے داد

پروفیسر نور کمال شاہ

خدانخواستہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے کہ میں کہیں "داد" کا منکر ہوں، "داد" کو پسند نہیں کرتا یا میں کسی کے "داد" دینے یا لینے کو مناسب خیال نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس میں اس پرانے فرسودہ عقیدے کا قائل ہوں کہ داد دینی چاہیئے اور بھرپور دینی چاہیئے - ہماری فاقہ مست قوم کے پاس ایک "داد" ہی تو ہے جو ہم دل کھول کے کسی کو دے سکتے ہیں - یہی تو ایک پونجی بچی ہے ہمارے پاس کہ جسے ہم جب اور جیسے چاہیں بافراط لٹا سکتے ہیں - اس دولت بے بہا کو کندھے سے لٹکائے ہم نگر نگر، شہر شہر اسے بانٹتے پھر رہے ہیں اور اپنے اس عمل کو سخاوت سمجھ کر حاتم طائی کو نیچا دکھانے کی فکر میں بھی ہیں ---- یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر

مجھے اگر کوئی اعتراض ہے تو وہ صرف اور صرف "داد" کے نامناسب اور غیر منصفانہ تقسیم پر ہے - "داد" عطا کرتے ہوئے ہم انصاف و مساوات کے زریں اصولوں کو یک لخت فراموش کر بیٹھتے ہیں اور ذاتی پسند و ناپسند کو ترجیح دے کر انصاف کا خون کر دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے -

کون ہے جو شاباش نہیں چاہتا - داد طلبی تو گویا ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور یا شائد یہ انسانی جبلت کا خاصا ہی ہو - ہر کوئی داد لینے کا طالب اور تمنائی دکھائی دیتا ہے - طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ہم اچھے برے ہر دو عمل پر داد چاہتے ہیں، ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے داد ضرور ملے اور بھرپور ملے خواہ اس نے داد کے لائق کوئی کام کیا ہو یا نہیں - بنظر غور دیکھا جائے تو پورا انسانی معاشرہ ہی اس بیماری میں مبتلا نظر آتا ہے - قابل تحسین کو تو خیر داد ملنی ہی چاہیئے کہ یہ اس کا حق بنتا ہے اور اسی داد کے سہارے اسے آگے بھی کارہائے نمایاں انجام دینے کا حوصلہ ملتا ہے (بشرط یہ کہ دوسرے اشرف المخلوقات اسے آسانی سے سہہ سکیں اور اس کے چھپے دشمن نہ بنیں) مگر نااہل کو داد کیوں اور کس لئے؟ سارا مسئلہ ہی یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ کوئی بھی نااہل و نالائق بندہ بشر، حقداروں سے کہیں زیادہ داد و شاباش کا خواہشمند رہتا ہے - جبھی تو ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ہر کوئی داد کے پیچھے دیوانہ بنا پھرتا ہے - معرکہء حق و باطل زور و شور سے برپا ہے اور خدا جانے اس کا انجام کیا ہوگا، دیدہء عبرت نگاہ تماشا دیکھنے کی منتظر ہے - اس عالم آب و گل کا غور سے مشاہدہ کریں تو شائد ہی کوئی ایسا فرد ملے جو داد سے نفرت کرتا نظر آئے اور یہ کہتا سنائی دے؛

نہیں ہے داد کا طالب یہ بندہء آزاد

چنانچہ ہمارے ہاں "داد" دینے اور لینے کا سلسلہ تمام شعبہ ہائے زندگی تک پھیلا ہوا ہے - چلیں گھر سے ہی ابتداء کرتے ہیں - بیوی ہمیشہ شوہر سے داد کی متمنی تو شوہر ہمہ وقت بیوی کی تعریفوں کا ہی شائق رہتا ہے - بیگم صاحبہ کو تو خیر شادی کے اولین آزمائشی دور یعنی پروبیشن پیریڈ میں ہی ساس اور نندوں کی جانب سے داد ملنا شروع ہو جاتی ہے؛ بعد میں جب پروبیشن پیریڈ کے سال دو سال مکمل ہو جاتے ہیں تو وہ یہی داد ساس اور نندوں کو دوگنی مقدار اور بہتر معیار کے ساتھ لوٹانا شروع کر دیتی ہے - حاکم اپنے کارندے کے منہ زبانی اپنی تعریف سننا چاہتا ہے تو ملازم آقا کی داد و شاباش کا محتاج رہتا ہے - استاد شاگردوں کی زبانی مدح سرائی کے انتظار میں رہتے ہیں تو شاگرد استاد کی تعریف کے جویا رہتے ہیں - جناب وزیر اعظم اپنے وزراء کے ہونٹوں سے اپنی مدح اور کارنامے سننا چاہتے ہیں تو وزراء وزیر اعظم صاحب سے داد کے خواستگار رہتے ہیں - افسر اپنے ماتحت کے قصیدوں کا شوقین رہتا ہے تو بعینہ اسی طرح ماتحت، افسر کے نگاہ لطف و کرم کے تمنائی رہتے ہیں - غرض ہر کوئی لگا ہوا ہے کہ اسے کسی طرح داد دے کر یہ تسکین پہنچائی جائے کہ وہ بہترین ہے اور اسکے بغیر یہ کارخانہ قدرت چوپٹ ہی رہے گا اگر اس کا کردار متعلقہ شعبے سے نکال دیا جائے تو -

معاشرے میں پائی جانے والی داد طلبی کی روایت گھروں اور محلوں سے نکل کر حکومت کے ایوانوں اور کھیل کے میدانوں سے ہوتی ہوئی مشاعروں اور اب سماجی رابطوں کے پروگراموں فیس بک، واٹس اپ اور میسنجر تک رسائی پا چکی ہے - ہر جگہ داد بٹ رہے ہیں، البتہ ہر شعبے میں داد و شاباش کا انداز اور طریقہ دوسرے سے مختلف ہی رہتا ہے -

گھر کے ماحول کو پرسکون رکھنے کے لئے برسوں کا آزمودہ نسخہ استعمال کرنے پر زور دیا جاتا ہے - تعریف کرنی ہے اور دل کھول کے کرنی ہے - خاتون خانہ کے حسن و زیبائی کے قصیدے اور اس کے ہر اچھے و برے عمل پر داد کامیابی کی کلید ثابت ہوتی ہے - اس لئے گھر کی فضاء کو خوشگوار رکھنے کے لئے داد دینے کی روایت کی پاسداری لازمی اور ضروری خیال کی جاتی ہے (چاہے اس بے موقع و بے محل داد سے آپ کا دل نازک پر خوں کیوں نہ ہو جائے) -

اب آیئے ہمارے مشاعروں کی جانب کیونکہ آج کل داد کو ہم نے تقریباً اسی شعبے کے لئے ایک طرح سے مخصوص کر رکھا ہے - ایک دانشور نے کسی جگہ بڑے پتے کی بات بیان کی ہے - وہ لکھتے ہیں، "حقیقت تک رسائی چاہتے ہیں تو جان رکھیں کہ تماشے میں زور تماشائیوں کے شور سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ مداری کی ڈگڈگی سے" - اسی اصول کو ہم نے اپنے مشاعروں میں کامیابی سے برتا ہے - یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے مشاعرے اچھی شاعری کے بل بوتے پر تو شاذ و نادر البتہ بے تحاشا داد و شاباش کے ہنگامے اور شور شرابے پر ہی زیادہ کامیاب رہتے ہیں - ایک طرف اگر ہمارے شاعر حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ داد سمیٹنے کا موقع ملے؛ چاہے ان کی شاعری جیسی بھی ہو؛

جو بھی ملے جہاں بھی ملے جس قدر ملے

تو دوسری طرف مشاعرے کے منتظمین بھی بے تحاشا داد و شاباش کو کامیابی کی کلید سمجھتے ہیں، چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دوران مشاعرہ طوفان بدتمیزی اپنی پوری جوبن پر ہی نظر آ رہا ہوتا ہے - نامور شاعر اور

دانشور محترم انور شعور صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ " ایک اچھا مشاعرہ شاعر کے کلام کے علاوہ سامعین کی داد بھی مانگتا ہے " - چنانچہ "داد" کی اسی اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہر مشاعرے میں شعراء کو جمع کرانے کے ساتھ ساتھ سامعین کی خاصی تعداد کا بھی مناسب بندوبست کیا جاتا ہے تاکہ مشاعرے کی رونقیں برقرار رکھی جاسکیں-

مشاعرے میں شاعر کو دو طرفہ ردعمل کا سامنا کرنا ہوتا ہے- ایک طرف اگر اسے سامنے بیٹھے عوام کی پسندیدگی درکار ہوتی ہے تو دوسری طرف شریک محفل و شریک مشاعرہ شعراء حضرات کی داد بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے- شاعروں کی داد سامنے بیٹھے عوام کی رائے بدلنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے کیونکہ عوام بیچارے بھی تو ہوا کا رخ دیکھ کر ہی اپنی سمت کا تعین کرتے رہتے ہیں- وہ جب دیکھتے ہیں کہ شعراء بھی جی کھول کے داد دے رہے ہیں تو انہیں بھی شور شرابے کا طوفان مچادینے کا شوق چراتا ہے- لہذا کلام سنانے والے شاعر کے حق میں زیادہ بہتر یہی ہوتا ہے کہ اسے موجود دیگر شاعروں کی پسندیدگی کی سند ملے- مصیبت یہ ہے کہ داد لینے کے لئے داد دینا از حد ضروری ہوتا ہے- آپ کسی اور کو زور و شور سے داد دیں گے تب ہی تو آپ کو داد ملے گی - چنانچہ اچھل اچھل کے اور جھوجھام کے داد دینے کا بڑا فائدہ ہی یہی ہوتا ہے کہ جواباً" آپ اپنی باری پہ اسی قسم کی داد کی توقع اور امید رکھ سکتے ہیں- اس قسم کی صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کی شاعری پر داد کا طوفان اٹھایا جاتا ہے- وزن سے ہٹے، بحر سے گرے اور تخئیل سے بے گانہ اشعار پر بھی اتنی داد مل جاتی ہے کہ ہم جیسے سخن ناشناس بھی سر پیٹتے ہی رہ جاتے ہیں- ایک بات اور بھی ذہن نشین رکھیں کہ جس نے آپ کو زور و شور سے داد دی جواباً" اسے اگر داد نہیں ملی تو پھر مفت کی دشمنی کے لئے تیار ہی رہیئے گا-----!!!

روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں جوش ملیح آبادی کسی بے تکے شعر پر زور زور سے داد دے رہے تھے - کسی نے سرگوشی میں پوچھا، " حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" انہوں نے زیر لب جواب دیا، "منافقت"-

کہا جاتا ہے کہ ایک مشاعرے میں ظہیر کاشمیری صاحب گئے - اب وہاں پر عجیب قسم کی صورت حال بن رہی تھی- شاعر صاحب آتے، اشعار پڑھتے اور واپس چلے جاتے- سامعین و حاضرین مکمل خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے، ہاں یا ناں میں کسی بھی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا، یوں لگ رہا تھا گویا سب نے ہونٹ سی لئے ہوں- ظہیر صاحب کی باری آئی تو سامعین میں سے کسی کو مخاطب کر کے بلند آواز میں پکارے، " اے سامنے بیٹھے شخص! ذرا میرے پاس تو آ"- ایک شخص ڈرتے ڈرتے اٹھے اور ان کے پاس پہنچے تو ظہیر صاحب انتہائی سنجیدگی سے بولے،، "باہر جا کر ایک اینٹ ہی لے کر آ اور میرے سر میں دے مار، اے کچھ تو کرو"- اک دم سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا؛ اور پھر مشاعرہ خوب چلا-

اسی "داد" کی طلب اور خواہش میں خواجہ حیدر علی آتش بھی تو پکار اٹھے تھے؛

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

کہتے ہیں ایک دفعہ ایک مشاعرے میں کسی شاعر نے جب اپنا کلام سنایا تو سامعین میں سے کوئی دل گرفتہ رونے لگا - شاعر نے متاثر ہو کر اس سے بڑی ہمدردی کے ساتھ پوچھا، " کیا آپ میری شاعری سے بددل ہو گئے ہیں؟" جواب ملا، " آپ کی شاعری سے نہیں بلکہ میں زندگی سے بددل ہو گیا ہوں کہ کیسا کیسا کلام سننا پڑ رہا ہے"-

داد" کے بدلے "داد" والی روایت اب صرف مشاعروں تک محدود نہیں رہی بلکہ اب تو ہم اس فن کو مزید ترقی دے کر زندگی کے دوسرے شعبوں تک بھی لے کر آئے ہیں- فیس بک اس کی سادہ سی مثال ہے- فیس بک پہ روزانہ کے حساب سے مختلف النوع پوسٹیں لگائی جاتی ہیں؛ کچھ ہمارے شعبے و مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں اور کچھ عجیب و غریب ق قسم کی غیر متعلقہ پوسٹیں ہوتی ہیں- یاد رکھیں اگر فیس بک فرینڈ شپ کو برقرار رکھنا ہے اور ساتھ ہی اپنی لگائی پوسٹوں پر بھی زیادہ پسندیدگی حاصل کرنی ہے تو سامنے آنے والی ہر پوسٹ کے لئے "لائک" کا بٹن دبانا ہے- اگر ایسا نہیں کریں گے تو مجال ہے کوئی آپ کی انتہائی سنجیدہ اور ضروری پوسٹ پر بھی آپ کو "لائک" کا اعزاز عطا کردے- یاد رہے کہ فیس بک پر "داد" کا کم سے کم درجہ "لائک" کہلاتا ہے-

سوفیس بک پہ بھی شاعری کا میدان گرم ہے- جدید، تر و تازہ اور عجیب و غریب قسم کے کلام پیش ہو رہے ہیں اور انہیں "واہ واہ"، "شاباش"، " کیا کہنے جی "، "زبردست" کے تمغے عطا کئے جا رہے ہیں- بعض اوقات تو ایسے ایسے اشعار سامنے آتے ہیں کہ شاعری کے متعلق ہمارا ذوق اور شوق بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے- جب ان عجیب و غریب اشعار کو دیکھتے ہیں اور نیچے کمنٹس میں "لائک" کی تعداد اور لوگوں کے تعریفی تبصرے پڑھتے ہیں تو دل میں تو یہی آتا ہے کہ شاعر کو تو خیر فی الحال چھوڑیں، ان کے ناقدین و حواریوں کو حقے کے پانی سے غسل دیا جانا چاہیئے - بہر حال یہی مداح اچھے بھلے انسان کو شاعر بنا کر ہی چھوڑتے ہیں؛ ہم کو دعائیں دو تمہیں "شاعر" بنا دیا

بحث چھڑی تو استاد یاری خان نے حسب معمول اپنی نرالی منطق پیش کی، کہنے لگے، " کل ایک شخص کو دوسرے کے پیچھے بے تحاشا بھاگتے دیکھ کر میں نے بڑی مشکل سے اسے روکا اور سبب دوڑنے کا دریافت کیا تو وہ بولے؛" خود اپنی غزلیں سنا کر مجھ سے "واہ واہ" تو کرائی اور جب میری باری آئی تو بھاگ کھڑے ہوئے"- یارو! اگر سوچو تو ہمارے ہاں ہر آدمی غلط جگہ پر فٹ ہو چکا ہے- جس بندے کو جہاں اور جس شعبے میں ہونا چاہیئے تھا بدقسمتی سے وہ وہاں نہیں ل لگا ہوا- جس کو ڈاکٹر یا انجنیئر ہونا چاہیئے تھا اسے ہم نے مکینک بنا دیا ہے- جسے استاد ہونا چاہیئے وہ کاروبار چلا رہا ہے- ہم نے تو گویا مجنوں کو تیشہء فرہاد تھما دیا ہے اور فرہاد سے صحرا نوردی کرا رہے ہیں- آدم خان کو بانسری بجانے پہ مامور کر دیا ہے تو رانجھے سے بندوق چلوا رہے ہیں- اب ان نامانوس شعبوں میں نام کیسے اور کیونکر پیدا کیا جائے اور داد و شاباش اگر دی جائے تو کونسی کامیابی پر"-

اور میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی ہم ایسا ہی کر رہے ہیں اور کہیں ہم ٹھنڈ سے حرارت اور گرمی پانے کی توقع اور امید پر تو نہیں بیٹھے ہوئے؟

حافظ عذیر احمد گڑھی شاہوی

ابرار ندیم

16 اکتوبر 2021ء ہمارے دوست حافظ عذیر احمد گڑھی شاہوی بین الاقوامی شہرت کے حامل اردو زبان و ادب کے ایک ایسے منفرد شاعر ہیں جن کے فریش جوس کی "مشہوریوں" اور دوستیوں کا سلسلہ گڑھی شاہو، امریکہ، کینیڈا سے لیکر خلیجی ریاستوں اور یورپ سے ہوتا ہوا ترکی، برطانیہ تک پھیلا ہوا ہے مگر اتنی مشہوری کے باوجود پتا نہیں حافظ صاحب کی کیا "بیڈ لک" ہے کہ کسی بھی اخبار یا رسالے میں جب بھی ان کے حوالے سے کوئی مضمون، کالم یا ان کا اپنا کلام چھپتا ہے تو کمپوزر حضرات اکثر اُن کے نام عذیر احمد کی جگہ عزیز احمد اور معروف ادیب کی جگہ "معروف عجیب" ٹائپ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ مشہورِ عالم محاورہ "جنے لاہور نہیں تکیا اوہ جمیا ای نہیں" کی طرز پر لاہور سمیت بیرون ممالک رہنے والے ہمارے سبھی شاعروں، ادیبوں میں یہ بات عام ہے کہ جس نے حافظ عذیر احمد گڑھی شاہوی سرکار کے "آستانے" سے مفت کا جوس نہیں پیا وہ ادیب ہی نہیں ہے۔ گویا فی زمانہ لاہور کے ادبی منظر نامے میں شاعروں ادیبوں کو باقاعدہ رجسٹر ہونے کے لئے گڑھی شاہو میں حافظ جوس کارنر سے مفت جوس پینے کی سند حاصل کرنا لازمی ہے۔ سو حافظ صاحب کے ہاں اس مفت جوس پینے کے چکر میں اب تک حافظ صاحب کا شاید ہی کوئی واقف کار بچا ہو جسے شاعر ادیب ہونے کا دعویٰ نہ ہو۔ اس لئے کہ غریبوں کے علاوہ یہاں مفت جوس پینے کی سہولت صرف ادیبوں کو حاصل ہے وگرنہ تو حافظ صاحب اتنے ظالم کاروباری ہیں کہ بغیر خریدے خود بھی اپنی دوکان سے کبھی مفت جوس نہیں پیتے۔ گمان ہے کہ تازہ پھلوں کا جوس پینے کے حوالے سے ہمارے لاہوری شاعروں ادیبوں میں "مفت بری" کی یہ روایت تب سے شروع ہے جب سے حافظ صاحب اپنی دوکان پر آنے والی کسی حسینہ کو جوس پلانے کے بعد اُسے بل دینے کی بجائے اپنا دِل دے بیٹھے ہیں۔ جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی ستم ظریف ادیب نے اپنے دو وقت کی روٹی کے لئے انہیں زبردستی شعر و شاعری کے دھندے میں پھنسا دیا ہے۔ اب حافظ صاحب کے دل کا حال خدا جانتا ہے یا وہ خود کہ اُن کے اندر سچ مچ کسی شاعر نے جنم لیا ہے یا وہ "سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری" کے مصداق جھوٹ موٹ کے شاعر بنے ہوئے ہیں۔ اس شک کو اس وقت زیادہ تقویت ملتی ہے جب وہ کسی مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہوئے غیر ارادی طور پر غزل اور فروٹ منڈی میں آڑھتیوں سے اپنے حساب کتاب کو آپس میں گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ بہرحال حقیقت جو بھی ہے اب صورتحال یہ ہے کہ گڑھی شاہو میں حافظ صاحب کے ڈیرے پر شاعروں ادیبوں کی "جوک در جوک" آمد سے حافظ صاحب کی مقبولیت کا گراف تیزی سے اوپر اور اُن کے کاروبار کا گراف تیزی سے نیچے جانا شروع ہو گیا ہے۔ امکان ہے کہ حافظ صاحب کی اِن "ادبی خدمات" کے اعتراف میں ادیب برادری بہت جلد ان کے فریش جوس کے اڈے کو "پاک ٹی ہاؤس" کی طرز پر "پاک جوس ہاؤس" کا درجہ دے دے۔ جہاں حافظ صاحب کی صدارت میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں اُن کے شعروں پر داد دینے کے حساب سے صرف منتخب شرکاء کی تازہ پھلوں کے جوس سے تواضع کی جائے گی۔ شروع شروع میں حافظ صاحب کے ہاں فریش جوس پی کر اپنی صحت بنانے کا یہ سلسلہ صرف دو تین شاعروں، ادیبوں تک محدود تھا جو مفت کا جوس پینے کے ساتھ وہاں بیٹھے بیٹھے حافظ صاحب کے کھاتے میں ایک آدھ ڈبی سگریٹ کی بھی پی جاتے تھے۔ اس حوالے سے اصل "لٹ" اس وقت سے پڑی ہے جب سے ان کے کسی "خیر خواہ" نے حافظ صاحب کو مارکیٹ میں اُن کا ذاتی شعری مجموعہ لانے کا راستہ دکھایا ہے۔ اس خبر کے عام ہونے کے بعد تو جیسے حافظ صاحب کی مہمان نوازیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے اُن کے "در دولت" پر چھوٹے بڑے اور مہنگے سستے شاعروں، ادیبوں کی ایک لائن لگی رہتی ہے۔ جن احباب کو میرے اس دعوے پر ذرا سا بھی شک ہے وہ حافظ صاحب کا شعری مجموعہ "شام ہو گئی جاناں" پڑھ کر دیکھ لیں اگر اُن کو حافظ صاحب کے ایک ایک شعر میں فریش جوس، آئس کریم اور سگریٹوں کا ذائقہ، خوشبو یا دھواں محسوس نہ ہو تو میرا مشورہ ہے کہ وہ احتیاطاً ایک بار اپنا کرونا کا ٹیسٹ ضرور کروالیں۔ جہاں تک حافظ صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے تو اس حوالے سے میں یہ کہوں گا کہ حافظ صاحب ایک بے لوث محبت کرنے والے انتہائی مخلص اور پیارے انسان ہیں ان کو نا صرف تعلق بنانے بلکہ اسے نبھانے کا ہنر بھی آتا ہے۔ ایک بار جس سے دوستی کا رشتہ استوار کر لیں پھر اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا کر لیتے ہیں یا اُس کے ہو جاتے ہیں۔ یاروں کے یار اور اُس سے بھی بڑھ کر یاروں کے خدمت گار بلکہ "زکوٹا جن" ہیں اور بالکل اُسی کی طرح "مجھے کام بتاؤ، میں کیا کروں، میں کس کو کھاؤں" کی گردان الاپتے ہمہ وقت دوستوں کی خدمت کے لئے دستیاب رہتے ہیں۔ اس حوالے سے میں حافظ صاحب کو تین چار بار اندرون و بیرون ملک جس محبت اور عقیدت سے استادِ محترم عطاء الحق قاسمی صاحب کی خدمت کرتے دیکھ چکا ہوں وہ میرے لئے حیران کن ہونے کے ساتھ قابلِ رشک بھی ہے۔ اپنے گھر سے دور سفر میں جس محبت سے حافظ صاحب قاسمی صاحب کے کھانے پینے، سونے جاگنے، لباس اور آرام کا خیال رکھتے ہیں ایسا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ میں جب بھی قاسمی صاحب کے لئے حافظ صاحب کی خدمت کے والہانہ پن کو دیکھتا ہوں تو ایک طرف جہاں مجھے حافظ صاحب سے حسد محسوس ہوتا ہے وہاں قاسمی صاحب کی قسمت پر بھی رشک آتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مادہ پرستی کے اس دور میں بھی ایسی چاہت کرنے والا دوست دیا ہے۔ ایسے میں کبھی کبھار میرے دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ کاش حافظ صاحب سے ملتا جلتا کوئی سیکنڈ ہینڈ "پیس" لنڈے بازار میں بھی دستیاب ہوتا تو شاید ہمارے جیسا ماڑا بندہ بھی انہیں خرید کر اپنا پکے والا دوست بنا لیتا۔

انٹرویو: محمد حمید شاہد

1۔لوگ آپ کو نقاد/ ناول نگار اور افسانہ نگار کے طور پر جانتے ہیں ان تمام ادبی جہتوں کے ساتھ زندگی کی جہتوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

محمد حمید شاہد: زندگی کو میں نے ہمیشہ موت کے مقابل رکھ کر دیکھا ہے۔ اس کی اگر کوئی معنویت ہے یا قائم ہو سکتی ہے تو اسے الگ سے دیکھنے میں نہیں موت جیسی تلخ اور یقینی حقیقت کے ساتھ دیکھنے ہی سے ممکن ہے۔ میں ایسا اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ میں نے زندگی کو اور موت دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے؛ کہہ لیجئے چھو کر، اس کے ذائقے کو چکھ کر، اس سے بغل گیر ہو کر اور موت کا معاملہ تو یہ ہے کہ یہ تو میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی ہے۔ بائی پاس سرجری کے مراحل سے پہلے ایک دو بار، اور اس دوران بھی کچھ یوں ہوا کہ میں تھا اور نہیں تھا۔ پھر جب ہوش آیا تو فراق کا کہا یاد آیا:

کیا جانئے موت پہلے کیا تھی
اب میری حیات ہو گئی ہے

میں نے اپنے والد صاحب کے بدن سے ان کی روح کو یوں نکلتے محسوس کیا تھا جیسے میرے اپنے بدن سے روح نکل رہی ہو۔ پھر چھوٹے بھائی کی لاش کے ٹکڑے دیکھے تھے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں اپنے دوستوں کو گولیوں سے چھلنی ہوتے اور انہیں لاشیں ہوتے دیکھا اور بہن جو ٹھیک ٹھاک میرے ہاں آئی تھی، ہسپتال داخل ہوئی تو ان کے اپنے گھر میت گئی تھی۔ ہسپتال میں اس خوب صورت اور جواں سال لڑکی کا مرنا تو میں بھول ہی نہیں پاؤں گا؛ جی، زندگی بھر بھول نہیں پاؤں گا جو میرے ساتھ اس ہسپتال میں داخل ہوئی تھی جہاں میں اپنی گردے کی پتھری نکلوانے گیا تھا۔ نہیں اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم بے شک ایک روز ہسپتال پہنچے تھے، مگر وہ میرے ساتھ نہیں، اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ ایک خوب صورت جواں سال لڑکی جس نے اپنا گردہ اپنے باپ کو دینے کا فیصلہ کیا تھا کہ اس کا بوڑھا باپ مر رہا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ باپ بیٹی کا گردہ پا کر ٹھیک ہو گیا اور بیٹی مر گئی تھی۔ جسے زندہ رہنا تھا وہ مر گئی اور جو مر رہا تھا وہ زندہ رہا۔ تو یوں ہے کہ موت اور زندگی کی یہی کہانی ہے۔ زندگی جس کی حفاظت موت کرتی ہے؛ ایک خاص لمحے کے آنے تک۔ زندگی کاغذ کے ایک ٹکڑے کی طرح ہے جس کے دوسری طرف موت لکھا ہوا ہے۔ زندگی ختم ہوتی ہے تو موت کا خوف بھی ختم ہو جاتا ہے۔ موت کو موت آتی تو اسے موت کا خوف ہوتا۔ آپ کاغذ کے ایک ٹکڑے کو چاک کرتے ہیں تو اس کے دونوں رُخ چاک ہو جاتے ہیں۔ وہ رُخ جس پر زندگی لکھا ہوا ہے اور وہ رُخ بھی جس پر موت لکھا ہے۔ خیر، جو میں نے کہا یہی زندگی کو سمجھنے کا قرینہ نہیں ہے۔ یہ تو بس ایک زاویہ ہے۔ انسان بہت خوب صورت اور حیران کن تخلیقی وجود ہے؛ اس نے موت کو غچہ دے کر اپنی طبعی زندگی سے زیادہ جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ دیکھا جائے تو اصل انسانی جوہر ہی یہی ہے۔ جی، ایسی تخلیقی قوتوں کا اظہار جو اس دنیا میں انسان ہی کو ودیعت ہوئی ہیں اور اسی وسیلے سے وہ نباتات اور حیوانات کی طرح ختم ہونے والے زندگی سے اپنی زندگی کو مختلف کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کو اسی وسیلے سے مختلف کیا بھی ہے۔ میرا اور آپ کا معاملہ اسی زندگی سے ہے۔ اس زندگی کی کئی جہتیں اور کئی پرتیں ہیں۔ یہیں مجھے وہ مثال یاد آتی ہے جو ٹالسٹائی نے، اگر میں بھول نہیں رہا تو، اپنے معروف ناول "جنگ اور امن" میں دی تھی۔ اس کا کہنا کچھ یوں تھا کہ جب پھولوں پر منڈلانے والی شہد کی مکھی کسی بچے کو ڈنک مارتی ہے تو اس بچے کے نزدیک اس مکھی کا کام یہی ڈنک مارنا ہے۔ آپ جیسا شاعر پھولوں کا رس پیتے اس مکھی کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے شعر کا موضوع سوجھتا ہے۔ مکھیوں کو پالنے والے کے لیے اس کا کام بس شہد اکٹھا کرنا ہے۔ وہیں موجود ایک اور شخص کے لیے مکھیوں کا کام اپنے بچوں کے لیے غذا کا اہتمام کرنا اور ملکہ مکھی کو تر و تازہ اور توانا رکھنا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں نے ایگریکلچر کی تعلیم پارکھی ہے اور ہم نے پڑھا ہے کہ یہ شہد کی مکھی زرگل ایک پھول سے دوسرے پھول تک پہنچاتی ہے؛ جی نر پھول سے مادہ پھول کے بقچہ تک کہ اسے بارآور کرے۔ تو یوں ہے کہ ایک زرعی ماہر کے نزدیک اس مکھی کا یہی کام ہے۔ یہ زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہے؛ یگانہ کے لفظوں میں "جیسی جس کے گمان میں آئی"۔ یگانہ نے یہ بات علم اور علم کی حقیقت کے بارے میں کہی تھی۔ ایک سطح پر جا کر علم اور زندگی میں کوئی تفریق نہیں رہتی اس لیے یہی بات زندگی اور اس کی حقیقت پر بھی منطبق بیٹھتی ہے۔

2۔علم و ادب سے لگاؤ آپ کو وراثت میں ملا۔ گھر کا علمی و ادبی ماحول آپ کی زندگی اور آپ کے شوق پر کتنا اور کیسے اثر انداز ہوا؟

محمد حمید شاہد: ہمارے خاندان میں کوئی بھی مصنف نہیں رہا ہے۔ میں کسان گھرانے کا فرد ہوں۔ یہ الگ بات کہ میرے دادا نے یہ پیشہ ترک کیا اور اپنے گاؤں چکی سے پنڈی گھیب ہجرت کی کہ وہ چاہتے تھے ان کی اولاد تعلیم حاصل کرے۔ ان کے تین بیٹوں میں، ایک میرے والد صاحب ہی تھے جنہیں مطالعے کا بے پناہ شوق تھا۔ انہوں نے گھر میں ایک کتب خانہ بنا رکھا تھا۔ وہ کتاب لے کر جب اس کرسی میں جھولتے جس میں ٹاٹ لگا ہوا تھا اور اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو جاتے تو مجھے یہ منظر بہت دلکش لگتا تھا۔ وہ جونہی کتاب ایک طرف رکھ کر اس جھولا دینے والی

کرسی سے اٹھتے، میں جھٹ کتاب اٹھا کر اس میں جا بیٹھتا اور چاہے کتاب کا متن سمجھ میں آتا یا نہیں، اسے گھورتا رہتا اور کرسی جھولتا رہتا۔ اس عمل نے میرے تخیل کو ہرا بھرا کر دیا۔ ابا جان کی کچھ تحریریں رسائل میں میری نظر سے گزریں مگر وہ باقاعدہ لکھنے والے نہ تھے۔ مجھے یاد ہے جب میری پہلی کتاب ''پیکر جمیل'' چھپ کر آئی، وہ ان کی زندگی کا آخری دن تھا۔ تب تک وہ فالج کے حملے کے باعث بول نہیں سکتے تھے۔ میں نے کتاب ان کی آنکھوں کے سامنے کی، ان کی آنکھوں میں عجب سی چمک عود کر آئی تھی پھر میں نے انتساب والا صفحہ کھولا۔ کتاب کا انتساب امی اور ابو کے نام تھا؛ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور میری طرف محبت سے یوں دیکھا تھا کہ اب تک مجھے لگتا ہے جیسے وہ مجھے دیکھے جاتے ہوں۔ میں اسی کیفیت سے ہمیشہ قوت پاتا رہا ہوں۔

3۔ بنک مینیجر کی معروف پیشہ وارانہ زندگی کے ساتھ اپنے اندر کے ادیب کے ساتھ کیسے انصاف کیا؟

محمد حمید شاہد: بنک کی ملازمت کے دوران میں نے مختلف حیثیوں میں کام کیا اس میں بنک مینیجر ہونے کا مختصر زمانہ بھی شامل ہے۔ اپنی ریٹائرمنٹ تک میں ہیڈ آفس میں اہم ذمہ داریاں سرانجام دے رہا تھا۔ آخری پندرہ برسوں میں میرے پاس کریڈٹ ریکوری پالیسی جیسے انتہائی مصروف رکھنے والے امور رہے۔ خدا کا شکر کہ بہ طور بینکار میری صلاحیتوں کو مانا گیا اور مجھے جو توقیر ملی وہ کم کم لوگوں کا مقدر ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب بنک کے صدر صاحب ریٹائرمنٹ پر میری خدمات کے اعتراف میں مجھے میڈل پہنا رہے تھے تو ساتھ ہی کہے جاتے تھے کہ کاش سب دوسرے بھی آپ جیسے ہو جائیں۔ خیر واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی دوسرے جیسا نہیں ہو سکتا۔ وہاں مجھ سے کئی اور بھی اعلیٰ صلاحیتوں والے ہوں گے، بس یوں تھا کہ مجھے بنک کی بتیس سالہ زندگی میں ایسے مواقع ملتے رہے کہ میں اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو کام میں لاتا رہوں۔ اب رہا آپ کا یہ سوال کہ پیشہ وارانہ زندگی اور تخلیقی زندگی میں انصاف کیسے کیا؟ تو یوں ہے کہ میں نے عین آغاز میں ہی یہ طے کر لیا تھا کہ میں اپنی رزق کے وسیلے کو گدلا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے بہ طور بینکار اپنے ذمہ امور کو سرانجام دینے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ اپنی ادبی زندگی کو بالکل اس سے الگ رکھوں۔ یہی سبب ہے کہ جب تک میڈیا پر مجھے تمغہ امتیاز برائے ادب ملنے کی خبر نہیں آئی تھی شاید چند ہی لوگوں کو، اور وہ بھی ایسے لوگوں کو جن کی ادب میں دلچسپی ہوگی، یہ معلوم ہوگا کہ میں کچھ لکھتا لکھاتا بھی ہوں۔ ہاں وہ یہ جانتے تھے کہ میں نے بینک پالیسی کے ڈاکومنٹ کو بنایا، ان پر عمل درآمد کے مینول لکھے اور سرکلر ڈرافٹ کیے تھے۔ جب 14 اگست 2016 کو میڈیا پر مجھے صدارتی ایوارڈ دیئے جانے کی خبر آئی تو بنک کے صدر نے میرے اعزاز میں پرتکلف چائے کا اہتمام کیا اور ساتھ ناراض بھی ہوئے کہ تم اتنے بڑے لکھنے والے ہو اور ہمیں بتایا تک نہیں نہ کبھی کوئی کتاب دی۔ میں کہاں کا بڑا لکھنے والا تھا۔ میں تو ادب کا ایک طالب علم تھا اور ہوں اور اپنی اسی حیثیت پر خوش تھا اور خوش ہوں۔ تاہم جب وہ یوں کہہ رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے اپنی ادبی سرگرمیاں بنک کے اندر بھی جاری رکھی ہوتیں اور ایک بینکار کی حیثیت سے اپنا آپ نہ منوایا ہوتا تو کیا تب بھی میں اس پذیرائی کا حق دار ٹھہرتا؟۔ یقیناً ایسا نہ ہوتا۔ میں نے اپنے ادبی دوستوں سے میل ملاقات اور ادبی سرگرمیوں کو بنک سے باہر رکھا۔ یہ اگرچہ اپنی ذات پر ایک جبر تھا مگر بہت جلد مجھے اس جبر سے نباہ میں لطف آنے لگا۔ بنک کے بالکل الگ سے ماحول سے نکل کر میں مکمل طور ادیب بن جاتا۔ ادیب دوستوں سے ملاقاتیں اور باتیں، حلقہ ارباب ذوق، اکادمی ادبیات اور دوسری ادبی تنظیموں کے جلسوں میں شرکت، رات کو پڑھتے پڑھتے سو جانا اور اگلے روز چار بجے بستر چھوڑ کر لکھنے پڑھنے کی میز پر جا بیٹھنا میرا معمول ہو گئے۔ لکھنے پڑھنے کا عمل صبح آٹھ بجے تک رہتا پھر ناشتہ اور دفتر کی تیاری اور عین نو بجے دفتر پہنچ جانا۔ میرے گھر میرے بنک کے احباب نہ آتے تھے کہ ان کے ساتھ میری دوستی بنک تک تھی۔ بنک سے باہر اگر میری دوستی تھی تو ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور فنون لطیفہ سے منسلک لوگوں سے تھی یوں ایسا ماحول بن گیا تھا کہ میں دونوں جانب پوری توجہ دینے کے قابل ہو گیا۔

بات طول پکڑ رہی ہے مگر مجھے اس بینک میں اپنی بھرتی ہونے کے زمانے کا واقعہ یاد آ گیا ہے۔ کوئی پونے چار دہائیاں پہلے کا واقعہ۔ اس وقت بینک کے چیئرمین جمیل نشتر تھے۔ انہوں نے سپروائزڈ کریڈٹ اسکیم کے نام سے ایک نئے منصوبے کا آغاز کیا تھا۔ افسروں کی نئی بھرتیاں ہو رہی تھیں اور وہ خود انٹرویو لے رہے تھے۔ انٹرویو دینے والوں کی قطار میں، میں بھی شامل تھا۔ وہیں میں نے اس بینک کی مختلف وقتوں میں سربراہی کرنے والوں کے پورٹریٹس میں ایک تصویر دیکھی، جس کے نیچے مختار مسعود کا نام لکھا تھا۔ یہ نام میرے لیے اجنبی نہ تھا کہ ابا کے کتب خانے میں اُن کی کتاب ''آواز دوست'' موجود تھی جو میں نے پڑھ رکھی تھی۔ خیر انٹرویو کے لیے میری باری آئی سامنے جمیل نشتر تھے۔ مجھے لگا وہاں، ان کے ابا عبدالرب نشتر کی مونچھوں کی ہیبت بھی موجود تھی۔ سہم کر سامنے بیٹھ گیا۔ وہ میری اسناد الٹنے پلٹنے لگے۔ انہی میں ایک کاغذ کریکٹر سرٹیفکیٹ بھی تھا جس میں میرے یونیورسٹی کے مجلے ''گشت نو'' کے مدیر ہونے کی ایک آدھ سطر بھی موجود تھی۔ جمیل نشتر نے وہ کاغذ تھام لیا۔ اُچٹتی نظر اس پر ڈالی اور لکھنے پڑھنے کے بارے میں سوال جواب ہونے لگے۔ اور یہیں میں نے مختار مسعود کی ''آواز دوست'' کا ذکر کر دیا۔ وہ خوش ہوئے اور کہا جانتے ہیں ان کا اس بنک سے بھی تعلق رہا ہے۔ وہ میں باہر دیکھ آیا تھا۔ جھٹ بتا دیا کہ ان کی اس ادارے کی سربراہی کا

زمانہ کون سا تھا۔ انہوں نے کہا: "خوب"۔ اور میں جان گیا تھا کہ میں انٹرویو میں پاس ہو گیا تھا۔ کہنا یہ ہے کہ میں اس بنک میں بھی ادب کے وسیلے سے آیا تھا مگر میں نے بنک کے کام اور ادبی مصروفیات کو الگ الگ رکھا اور اس نے مجھے دونوں میدانوں میں بڑی حد تک سرخرو کیا۔

4۔ آپ کی کتب کے نام شاعرانہ خوبصورتی لئے ہوئے ہیں، یہی خوبصوری آپ کی نثر میں بھی غالب ہے۔ شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

محمد حمید شاہد: کتابوں کے نام آپ کو پسند آئے شکریہ۔ چوں کہ آپ کا تعلق شاعری سے ہے ممکن ہے اس لیے آپ کو یہ نام شاعرانہ لگے ہوں گے ورنہ ایک اور رُخ سے دیکھیں تو آپ کو یہی نام فکشن کے تقاضوں کے مطابق لگیں گے۔ مثلاً دیکھیں میرے ناول کا نام ہے ''مٹی آدم کھاتی ہے''؛ انسان کی زمین ہتھیانے کی ہوس، فرد کی سطح پر اور گروہی سطح پر مگر انجام کہ اسی انسان کو مٹی کا رزق ہونا ہوتا ہے۔ سنگ میل نے افسانوں اور ناول کی چھ کتب پر مشتمل میرا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس کا نام ہے "حیرت کا باغ"، آپ دیکھیں گے کہ جس طرح ناول کے نام میں فکشن کے اپنے تقاضے مدنظر رکھے گئے ہیں، اسی طرح یہاں بھی ہوا ہے۔ "حیرت کا باغ" کا نام "باغ حیرت" بھی رکھا جاسکتا تھا۔ مگر اس طرح باغ زیادہ توجہ پاتا اور حیرت کم۔ اگر یہ شاعری کا مجموعہ ہوتا تو میں باغ حیرت نام رکھتا مگر یہ تو فکشن کا مجموعہ تھا لہٰذا میں نے اس کے تقاضے کو سامنے رکھا۔ اور اضافت ختم کر کے حیرت فزوں اور مسلسل کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ فکشن کی زبان شاعرانہ نہیں ہوتی تاہم میرا یہ بھی اصرار ہے کہ یہ اتنی بے رس اور سطحی بھی نہیں ہوتی کہ اس کی اپنی کوئی جمالیات مرتب نہ ہو سکے اور یہ محض وقوعہ نگاری کا وسیلہ ہو جائے۔ فکشن لکھنے والے زبان کے ساتھ ایک سے زیادہ سطحوں پر معاملہ کرتے ہیں۔ جس ماحول اور فضا سے کہانی اور کردار متعلق ہوتے ہیں، اسی فضا سے اور زبان کے متعلقہ قبیلے سے لفظیات اور لہجے کا استعمال کیا جاتا ہے یوں کہ عام زبان کا التباس پیدا ہوتا چلا جائے، مگر یہ عام زبان عامیانہ نہیں ہوتی تخلیقی سطح پر خاص ہو جاتی ہے کہ اسے لکھتے ہوئے جملوں کی ساخت کے اندر ایسی گنجائشیں اور مقامات رکھ دیے جاتے ہیں کہ فکشن کی اپنی دانش اور بھید اس کا حصہ ہو جائیں۔ اسی سے ایک لکھنے والا اپنے متن کی جمالیات مرتب کرتا ہے۔ آپ کے سوال کا دوسرا حصہ شاعری کے بارے میں ہے۔ شاعری میرے مطالعے کے لیے وقف وقت کا بہت سا حصہ لے جاتی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ مجھے شاعری پڑھنے میں بہت لطف آتا ہے۔ اس سے میں بہت کچھ سیکھتا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ میں راشد، میرا جی اور فیض پر لکھنے کے قابل ہوا اور دوسرے شاعروں کے فن پر متعدد مضامین لکھے۔ حال ہی میں خدائے سخن میر تقی میر پر میرا کام شائع ہوا ہے۔ رہا شاعری کے بارے میں میرا خیال، تو میرا خیال وہی ہے جو احمد فراز نے اپنی ایک غزل میں شاعری کی بابت بتا رکھا ہے۔

شاعری تازہ زمانوں کی ہے معمار فراز
یہ بھی اک سلسلۂ کن فیکوں ہے یوں ہے

5۔ اکیسویں صدی میں جہاں دیگر اصناف جدت کے رنگ نظر آتے ہیں کیا ناول پر بھی جدت کا کچھ اثر ہے؟

محمد حمید شاہد: اردو ناول میں اس جدت کا اثر دیکھنے میں کم کم آیا ہے جس جانب آپ نے اشارہ کیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس جدت کے نئے نئے رنگ اردو افسانے میں نظر آتے رہے ہیں ویسے ناول میں کم کم نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اس عرصے میں ناول کی طرف توجہ ہوئی ہے اور جو کام سامنے آیا ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اس دورانیے میں لائق توجہ ناول لکھے گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ناول کی بنیادی خوبی اس کا نیا پن ہی ہے۔ ڈی ایچ لارنس نے کہا تھا کہ ناول ہم پر ہمارے زندہ رابطوں کی مسلسل بدلتی ہوئی قوس قزح کو منکشف کرنے کا ایک کامل وسیلہ ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بطور ناول نگار کسی ولی، کسی سائنس دان، کسی فلسفی، اور معاف کیجئے گا کہ کسی شاعر سے بھی بالاتر کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سب انسان زندہ انسان کے کسی ایک جزو کے عظیم ماہر ہیں مگر ان اجزا کی سالم صورت کا ادراک نہیں رکھتے۔ جی یہ لارنس نے کہا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ناول زندگی کی روشن کتاب ہوتا ہے۔ یہیں سے میں نے اخذ کیا ہے کہ محض واقعات کا انبار لگا لینا، چاہے وہ کتنے ہی دلچسپ اور مربوط کیوں نہ ہوں، ناول نگاری نہیں ہے۔ اگر آپ کا اشارہ اس جدت کی طرف ہے تو ناول لکھنے کی للک رکھنے والوں کو بدلتے ہوئے انسان کے باطن اور فضا کو اس کی زندگی کے واقعیاتی مظاہر کے اندر گرفت میں لینے والا بیانیہ متشکل کرنا ہوگا اور اگر آپ کی مراد اس جدت سے ہے تو ناول کے فن کا ناول نگار سے بنیادی تقاضا یہی تھا اور یہی رہے گا۔

6۔ آپ کے خیال میں ناول نگاری میں کس نے نمایاں کام کیا ہے؟

محمد حمید شاہد: اردو میں ناول نگاری کے باب میں لائق توجہ کام ہوا ہے۔ بڑی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں۔ ہمارے ہاں ناول اور افسانے کی اصناف کا رواج تب ہی پڑ گیا تھا جب یہاں استعمار کا دور تھا؛ خیر استعماری دور کسی نہ کسی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ اسے جملہ معترضہ جانیے۔ کہہ یہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں رزمیہ حکایات، داستانوں اور قصہ کہانی کی ایک روایت تھی جس سے برگشتگی کا ماحول انگریز نے پیدا کر دیا تھا۔ سرکار کے ایما پر ہی ہم اپنا مذاق بہتر بنانے میں جت گئے تھے۔ بہتر کو قوسین میں کر لیجئے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مرزا ہادی رسوا جیسے اہم لکھنے والے وقت کے تقاضوں کو سمجھ گئے تھے۔ 20 اگست 1868 کو الہ آباد کی حکومت نے جب یہ اعلان کیا تھا کہ مقامی زبان میں لکھے گئے مفید ادب پر انعام دیا جائے گا تو اگلے ہی برس شائع ہونے والے جس ناول

کو انعام کا حق دار ٹھہرایا گیا تھا وہ "مرۃ العروس" تھا؛ جی، ڈپٹی نذیر احمد کا ناول۔ یہ ناول سر ولیم میور کو بہت بھایا تھا اور اس نے ناول نگار کو اپنی دستی گھڑی انعام میں دی اور ہزاروں کا پیاں خرید کر تعلیمی اداروں میں بھجوا دیں۔ خیر ناول کی اس پذیرائی کے بعد سلسلہ چل نکلا۔ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا کہ عزیز احمد اور قرۃ العین حیدر جیسے باکمال لکھنے والے اس صنف کی طرف راغب ہو چکے تھے۔ احسن فاروقی اور فضل کریم فضلی نے بھی اس صنف میں اپنا حصہ ڈالا۔ شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، عبداللہ حسین، اکرام اللہ، مظفر اقبال، حسن منظر اور مستنصر حسین تارڑ سے لے کر فہیم اعظمی، انور سجاد اور انیس ناگی تک آ جائیں یا پھر نسیم حجازی، ایم اسلم، ابن صفی جیسے ناول نگاروں کو لے لیں۔ انتظار حسین کا ذکر بھی ہونا چاہیئے۔ خواتین میں قرۃ العین حیدر کا نام تو ہو چکا جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، رضیہ فصیح احمد، عذرا عباس اور بانو قدسیہ کے کام کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ بشریٰ رحمٰن اور رضیہ بٹ نے کیا کم لکھا۔ اکرام اللہ، احمد داؤد، مظہر الاسلام، مرزا اطہر بیگ، مرزا حامد بیگ، محمد الیاس، اسلم سراج الدین، خالد طور، اصغر ندیم سید، انور سن رائے، خالد فتح محمد اور دوسرے نئے لکھنے والوں آمنہ مفتی، سعید نقوی، اختر رضا سلیمی، شیراز دستی، ظفر سید، فاروق سرور، عاصم بٹ، طاہرہ اقبال، حفیظ خان، نیلم احمد بشیر، سید کاشف رضا، عاطف علیم، اقبال خورشید، حمیرا اشفاق، محمد عامر رانا، نیر مصطفیٰ، مصطفیٰ شاہد، قاسم یعقوب، غافر شہزاد اور اسامہ صدیق سب کا کام ہمارے سامنے ہے۔ ان میں وہ ناول نگار بھی شامل کر لیجئے جن کے سرحد پار ناول شائع ہوئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ کس کس نے اس بڑی صنف کے تقاضے پورے کئے، انسانی وجود کو اندر سے کھنگالا اور فکشن کی دانش سے معاملہ کیا۔ کون ہے جو نئی راہ سجھا گیا اور کون فقط چونکانے میں جتا رہا یا عامیانہ ذوق والے قاری کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس صنف کا بنیادی تقاضا ہی نہ نبھایا۔ اس حوالے سے دیکھیں گے تو ایسے ناول نکل آئیں گے جو لائقِ توجہ ہیں۔ بے شک ایسے بھی ہیں جن کا لکھا دھڑا دھڑ بک گیا مگر میرے لیے اہم وہ ہیں جو پامال راستوں سے بچ نکلنے کی صورتیں سجھاتے ہیں۔

7۔ پاکستانی ادب اور تنقید کا موازنہ عالمی ادب و تنقید کے ساتھ کیسے کریں گے؟

محمد حمید شاہد: جب جب ہمارے ہاں کے ادب کا موازنہ عالمی ادب سے کیا جاتا ہے تو نہ جانے کیوں میرا دھیان اس مرعوبیت کی طرف ہو جاتا ہے جس کے سبب ہم عالمی ادب کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اپنے ادب کو اس عالم سے بارہ پتھر باہر سمجھتے ہیں۔ گویا ہمارا ادب کسی اور سیارے کا ہے۔ اس عالم سے پچھڑا ہوا اور کہیں پیچھے پڑا ہوا ہے اور وہ ادب جو ہم نے انگریزی میں پڑھا یا انگریزی کے وسیلے سے ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچا وہی عالمی ادب کا معیار ہے۔ اس معیار کو جانچنے کے لیے ہماری تنقید نے بھی بہت جتن کیے ہیں اور اس جھونک میں ایسی سرگرمی ہو گئی ہے جو ادب کے تخلیقی عمل اور تعین قدر سے سرگرداں ہے۔ پہلے تو ہمیں اس مرعوبیت سے نکلنا ہوگا اور ادب کے تخلیقی عمل کو اس تناظر میں سمجھنا ہوگا جس میں وہ تخلیق ہو رہا ہوتا ہے۔ دیکھیے ہمارے ہاں کی شعری اصناف میں مقبول ترین صنف غزل کی ہے۔ میں اسے تہذیبی صنف کہتا ہوں آپ اسے عالمی ادب کے معیار پر آنکنا چاہیں گے تو اس پوری روایت کو تلف کر دینا ہوگا جس سے یہ صنف غذا پاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے جدید یا نیا بنانے کے حیلے کیے مگر اس نے اپنی روش ترک نہ کی۔ یہی معاملہ ان اصناف کا ہے جو قدرے کم تہذیبی ہیں اور فوراً ثقافتی اثرات قبول کر لیتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے وہ بھی روایت کی عطا کے قوی تخلیقی اجزا کو اپنے اندر جذب کیے بغیر تبدیلی کو قبول نہیں کرتیں۔ یہ نثر کی اصناف ہوں یا شاعری کی دونوں اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب سے پھوٹتی ہیں۔ میں تخلیقی عمل کو اس شجر طیب سے تشبیہہ دیتا ہوں جس کی جڑیں زمین میں جتنی گہرائی میں جاتی ہیں اتنا ہی وہ آفاق کی سمت اٹھتا چلا جاتا ہے۔ ادب کی مقامیت ہی میں اس کی آفاقیت نہاں ہوتی ہے لہٰذا اس کی تنقید کو بھی اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیئے۔

8۔ تخلیق اور تحقیق کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

محمد حمید شاہد: تخلیق، تنقید اور تحقیق ان تینوں کا دائرہ کار مختلف ہو کر بھی ایک تعلق قائم کر لیتا ہے اور ظاہر ہے ان کا یہ تعلق یا رشتہ ادب سے معاملہ کرنا ہے۔ تخلیق کا عمل فن کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ادب کی پیدائش ہے تو تنقید اس کی تفہیم، تعبیر اور تعین قدر سے معاملہ کرتی ہے جب کہ تحقیق اس باب میں ہو چکے کام کا جائزہ لیتی اور اس کی تاریخ مرتب کرتی جاتی ہے۔

9۔ کیا زندگی کے تجربات تخلیق پر اثر انداز ہوتے ہیں؟

محمد حمید شاہد: ادب کا بنیادی وظیفہ ہی تو یہی ہے کہ وہ زندگی کے تجربات کو کوئی معنویت دے پائے۔ کوئی نظریہ قائم کر کے نہیں بلکہ انسانی تناظر میں۔ فرد کے فرد کے ساتھ تعلق سے لے کر فرد کے اجتماع اور اس کائنات کے ہر مظہر سے تعلق اور سلوک کے تناظر میں۔ محض نظریات تو دوسراہٹ پیدا کرتے ہیں۔ یہ دوسراہٹ بھی بالک ہٹ کی طرح ہوتی ہے؛ اپنے آپ ہی کو سچ سمجھنا۔ یہ ایسا طرز عمل ہے جو انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ نظریہ چاہے کتنا ہی اعلیٰ اور انسانی فلاح و سلامتی والا کیوں نہ ہو، اس کے ماننے والے اسے بوسیدہ بنا دیتے ہیں۔ اس میں اپنی تفہیمات سے سہولت کی راہیں نکال لیتے ہیں اور یوں نظریات کی اپنی بنیادیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ درحقیقت سب نظریات میں سچائیاں مشترک ہو کر محترم ہوتی ہیں مگر جو ابھر کر سامنے آتا ہے وہ اختلاف اور افتراق ہی ہوتا ہے۔ ادب زندگی کو مشکوٰۃِ جمال سے دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ انسانی نفسیات کے طاقچے پر روشن ایسا چراغ

ہو جاتا ہے جو انسانی وجود کے تمام مراتب تک رسائی پیدا کر پائے اور تمام انسانی طبقات تک یکساں رسائی کے دریچے کھلے رکھے۔ آپ نے زندگی کے تجربات کی بات کی تو واقعہ یہ ہے تجربات ایک سے زیادہ نوع کے ہو سکتے ہیں۔ ایک تجربہ وہ ہے جو آپ لیبارٹری میں جا کر کرتے ہیں کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے۔ کچھ ثابت کرنے یا کوئی کلیہ اخذ کرنے کے لیے۔ دوسری نوع کا تجربہ کچھ ثابت کرنے یا اخذ کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ ہو جایا کرتا ہے۔ اچانک، بغیر ارادے کے۔ آپ کے حالات یا آپ کے رجحانات اور میلانات کے اندر سے پھوٹ پڑنے والا اور انہی سے جڑ کر اپنے امکانات کے دائروں میں وسعت پیدا کرنے والا۔ ایک تخلیق کار کا پہلی نوع کے تجربے سے کم کم اور دوسرے تجربے سے مسلسل معاملہ رہتا ہے۔

10۔ کیا آپ مجنوں گورکھپوری کے اس خیال سے متفق ہیں کہ پاکستان میں ادب کم اور ادب کے خوردہ فروش زیادہ پیدا ہو رہے ہیں؟

محمد حمید شاہد: اگر میں بھول نہیں رہا تو مجنوں صاحب نے یہ بات اپنے ایک مضمون، ادب اور مقصد میں کہی تھی۔ جس کتاب میں یہ مضمون شامل ہے اس کا نام، ادب اور زندگی ہے۔ یہ مضامین گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی میں لکھے گئے تھے۔ مجنوں صاحب کی گفتگو کا جو ٹکڑا آپ نے مقتبس کیا اسے ایک طرف رکھ دیں تو اس کتاب میں کئی کام کی باتیں ہیں اور ان سے بہت کچھ اخذ کر کے اپنی سمت درست کی جا سکتی ہے۔ خیر، مجنوں صاحب کے اس جملے کی طرف آتا ہوں۔ ادب کی تعریف پر بات کرنے کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ادب کا مقصد یہ ہے کہ اسے پڑھنے والا کسی وعظ اور تبلیغ کے بغیر اس کے اثر سے پہلے سے زیادہ مہذب، زیادہ شریف اور زیادہ نیک ہو جاتا ہے۔ یہ الفاظ مجنوں صاحب کے ہیں اور انہوں نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ ادب انسان کے کردار سے نفس پرستی، خود غرضی، بغض، حسد، کینہ وعناد، مکاری اور عیاری جیسے رکیک اور وحشیانہ میلانات سلب کرتا رہتا ہے۔ اپنے ادھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد مجنوں صاحب نے اس ادب کو دیکھا تھا جو ان کے زمانے میں لکھا جا رہا تھا اور انہیں خیال گزرا تھا کہ ادب کے اعلیٰ مقاصد پورے نہیں ہو رہے تھے۔ اور یہیں انہوں نے یہ بھی اضافہ کیا تھا کہ جو ادب ملک میں لکھا جا رہا ہے اس کا دسواں حصہ ہی شاید ایسا ہو جس کو اصلی ادب، سچا ادب اور کھرا ادب کہا جا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجنوں صاحب نے جو کہا یقیناً درست کہا ہوگا مگر سب جانتے ہیں کہ کسی عہد میں لکھنے والے بہت ہوتے ہیں اور بچ جانے والے یا ادب کی روایت میں اضافہ کرنے والے چند ایک۔ دس فیصد اگر بچ جائیں اور سچے کھرے ادب والے تخلیق کار کہلائے جانے کے لائق ٹھہریں تو میری نظر میں یہ اس عہد کے تخلیق کاروں کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ قریب نظری کا یہ شاخسانہ ہوتا ہے کہ بہت کچھ صاف نظر نہیں آ رہا ہوتا۔ اچھا برا لکھنے والے ہر عہد میں ہوتے ہیں۔ ادب کی اعلیٰ روایات میں اضافہ کرنے والے بھی اور بہ قول مجنوں صاحب خوردہ فروش اور بساطی بھی۔ یہ خوردہ فروش اور بساطی ہمیشہ اونچی ہانک لگاتے ہیں۔ یہاں وہاں ان کا چرچا زیادہ ہوتا ہے کہ ان کی چھابڑی میں چاہے دو نمبر مال ہو مگر وہ اپنے مال کی بابت تعریفوں کے پل باندھنے میں ذرا عار محسوس نہیں کرتے۔ یہ وہ فضا ہے جسے دیکھ کر مجنوں صاحب اور حسن عسکری صاحب جیسے لوگ خوردہ فروشی یا ادب کے موت جیسی باتیں کہہ جاتے ہیں ورنہ اچھا اور سچا ادب لکھنے والے پہلے بھی موجود تھے اب بھی موجود ہیں۔ کل کے خوردہ فروشوں اور بساطیوں کو آج کوئی نہیں جانتا اور یقین رکھیے آج کے خوردہ فروش اور بساطی بھی کل نہیں رہیں گے۔

11۔ افسانہ کیا ہے؟ آپ کے نزدیک معیاری افسانے کی تعریف کیا ہے؟

محمد حمید شاہد: افسانے کے فن کے بارے میں میرا کہنا ہے کہ یہ زندگی کی تخلیق نو ہے۔ یہ زندگی عین مین وہ نہیں ہوتی جو ہم جی رہے ہوتے ہیں یا کہہ لیجیے جینے کے جتن کر رہے ہوتے ہیں، افسانے میں آ کر زندگی کے اس پیٹرن میں حک و اضافہ ہو جاتا ہے اور یوں زندگی کا نیا چہرہ سامنے آتا ہے؛ ویسا جیسا ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسا محض خواب کی سطح پر نہیں ہوتا کہ خواب تو اکثر غیر مربوط اور کسی لاجک کے بغیر ہوتے ہیں۔ افسانے میں یہ پیٹرن اس سے کہیں بڑھ کر حقیقی ہوتا ہے اور اپنے پیچھے فکشن کی اپنی منطق رکھتا ہے۔ اب رہا معیاری افسانے کا سوال تو اس باب میں ایک آدھ سطر میں بات نہیں نمٹائی جا سکتی۔ میں اس باب میں تفصیل سے لکھتا آیا ہوں مختصر لفظوں میں یوں ہے کہ کہانیاں کسی اور دنیا سے ہمارے پاس نہیں آتیں، ہمارے آس پاس ہی ہوتی ہیں، ان کہانیوں کے فکشن بننے کے درمیان اگر کچھ حائل ہوتا ہے تو وہ کوئی اور نہیں ہم خود ہوتے ہیں۔ ہم بھی اور ہماری زبان بھی۔۔۔ اور ہاں اگر انہیں کوئی بدل کر فکشن بنا دیتا ہے تو وہ بھی ہم ہوتے ہیں۔ جی ہم اور ہماری زبان بھی۔ یہاں ہم سے مراد وہ تخلیق کار ہیں جو یہاں وہاں موجود کہانیوں میں سے کوئی کہانی اپنے نام کر لیتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ تخلیق کار کسی اور دنیا کے باسی نہیں ہوتے، ہماری اپنی دنیا کے ہوتے ہیں۔ یہ میں بھی ہو سکتا ہوں اور آپ بھی۔ مگر یاد رہے میں آپ نہیں ہو سکتا نہ آپ میں۔ یہ حقیقت تسلیم کی جاتی ہے کہ جب ہم سے دوسرے منہا ہو جائیں تو ہمارا وجود اور ہماری شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ اگر ایسا ہے، اور یقیناً ایسا ہی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کہانی جو آپ کے پاس آئے اور آپ کے وجود کے اندر اتر کر کاغذ پر اپنا وجود پائے وہ میرے وجود سے ہو کر

کاغذ پر اترتے ہوئے عین مین ویسی رہے جیسی آپ کے قلم کا کرشمہ ہوئی۔ اسے ہر حال میں مختلف ہونا ہوتا ہے اور اگر مختلف نہیں ہوتی تو یقین جانیے کہیں نہ کہیں معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ گڑبڑ ہی کہانی کو آپ کے لفظوں میں "معیاری" کے درجے تک نہیں پہنچنے دیتی۔ اچھا، اس سارے عمل کو ایک اور رُخ سے دیکھتے ہیں اور اس ہو چکی بات کو کچھ نقاط کی صورت سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے نقطے کے سامنے میں نے "مشاہدہ" لکھ لیا اور اس کے دو ذیلی نقاط "الف" اور "ب" بنا لیے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ "مشاہدہ الف"، محض دیکھنے کا عمل نہیں ہے آپ اور میں ایک وجود ہو کر نہیں دیکھ سکتے کہ یہ ہماری وجودی مجبوری ہے۔ ہم پہلو بہ پہلو کھڑے ہو کر دیکھیں گے یا آپ بیٹھ جائیں گے اور میں آپ کے عقب میں کھڑا ہو کر دیکھ لوں گا دونوں صورتوں میں نظر کا زاویہ بدل جائے گا۔ ایسے میں دیکھے جانے والے منظر کی جو تصویریں میرے ذہن کے البم میں محفوظ ہوں گی، ان کی کچھ لکیریں اور رنگ ان تصویروں سے مختلف ہوتے چلے جائیں گے جو آپ کے ذہن کے البم کا حصہ بن پائیں۔" مشاہدہ ب" کی ذیل میں کہنا ہے کہ ہماری آنکھ محض کیمرہ نہیں ہے کہ کھٹ کھٹ بس تصویریں بناتی چلی جائے۔ یہ دیکھے جانے والے منظر سے ایک تعلق قائم کرتی ہے، اس لیے کہ یہ آنکھ زندہ انسانی وجود کی ہے۔ جی، زندہ انسانی وجود کی، جو ایک حسیاتی نظام رکھتا ہے۔ تاہم کچھ کے ہاں یہ حسیاتی نظام اتنا فعال ہوتا ہے کہ معمولی سے معمولی لرزش پر بھی ردعمل ظاہر کرتا ہے اور کچھ کے ہاں قدرے کم فعال کہ بہت سی کروٹوں کو دیکھ کر ان دیکھا کر دیتا ہے۔ ایک منظر پر کوئی آنکھ جھٹ گیلی ہو جائے گی اور کوئی بٹر بٹر دیکھتا چلا جائے گا۔ لکھنے والوں کے ہاں یہ حسیاتی نظام بہت فعال سہی مگر ہر ایک کے ہاں یہ فعالیت بھی ایک سی نہیں ہوتی یوں مشاہدے میں جو تیسری جہت یا گہرائی پیدا ہوتی ہے وہ ہر ایک کے ہاں مختلف ہو جاتی ہے۔ مشاہدے کے بعد زبان کی طرف آتے ہیں کہ جو کہانی مشاہدے کے وسیلے سے آئی، اسے لکھنے والے نے اپنی زبان میں لکھنا ہوتا ہے۔ کہانی کا ہر منظر تصویروں کے ایک سلسلے کی صورت میں آپ کے ذہن میں محفوظ تھا اور میرے ذہن میں بھی۔ اور ہم یہ اخذ کر چکے تھے کہ دونوں کے پاس کہانی ایک ہو کر بھی ان تصویروں میں مختلف ہوتی چلی گئی تھی۔ لیجیے میری اور آپ کی زبان اسے اور بھی مختلف کرنے جا رہی ہے۔ میرا اور آپ کا ذخیرہ الفاظ ایک سا نہیں ہے۔ میرا اور آپ کا لہجہ مختلف ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کا انداز جداگانہ ہے۔ پھر ہمیں یہ اختیار بھی ہے کہ جملے کی ساخت بدل بدل کر ایک ہی بات کو بیان کرنے کا انداز بدل لیں۔ گویا اُن تصویروں کو جو ہمارے ذہن میں ہوتی ہیں ہر بار ایک ترتیب میں کاغذ پر نہیں اتارتے۔ پھر انسانی ذہن کی کارکردگی ہر صورت میں ایک سی نہیں رہے گی کہ لکھتے ہوئے کچھ تصویریں آپ کے ہاں طاق نسیاں پر دھری رہ جائیں گی اور کچھ میرے ہاں۔ ہم دونوں کے ہاں کچھ تصویریں زیادہ روشن ہو کر فن پارے میں متن ہوں گی اور کچھ کے رنگ پھیکے رہ جائیں گے اور ہم دونوں کے ہاں اس کا انتخاب اپنا اپنا ہوگا۔ گویا ہر تخلیق کار کو زبان اور کہانی سے تخلیقی سطح پر معاملہ کرتے ہوئی اپنی انفرادیت کے ہالے ہی میں رہنا ہوتا ہے۔ ایک اور نقطہ ہے: اسلوب۔ اسلوب کا چرچا آپ نے سنا ہوگا تو یہ جان لیجیے کہ بن بن کر لکھنے اور بنا بنا کر لکھنے سے اسلوب نہیں بنتا یہ تو شخصیت کی تخلیقی تظہیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسلوب ایک الگ موضوع ہے اور طویل گفتگو کا متقاضی۔ میں اپنی بات مختصر کرنے کا حیلہ کرتے ہوئے روایت پر ایک آدھ بات کرنا چاہوں گا کہ یہ اصطلاح ہمارے موضوع کو سمجھنے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ روایت سے مراد روایتی ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اس باب میں ہو چکے اس تخلیقی تجربے سے اکتساب ہے جو تہہ در تہہ اسی روایت میں موجود ہوتا ہے۔ روایت کی بابت بات کرتے ہوئے میرے ذہن میں فکشن لکھے جانے کے وہ جدید اور جدید تر تجربات بھی ہیں جو روایت سے انحراف کے دعوے کے ساتھ وجود میں آتے ہیں گویا جب ہم افسانہ لکھنے کا ارادہ باندھتے ہیں تو منظر اور پس منظر، گزر چکے اور گزر رہے ہر تخلیقی تجربے کا اثر قبول کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک کھرے، سچے اور جینوین تخلیق کار کے ہاں یہ تجربات عین مین ویسے ظاہر نہیں ہوتے جیسا کہ اس نے ان سے اکتساب کیا ہوتا ہے وہ اس کے ہاں وہ کھاد ہو جاتے ہیں جسے زمین میں دبا کر کچھ وقت کے لیے یوں چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے اسے بھول ہی گئے ہوں۔ یہی انحراف دراصل انفرادیت کا وہ بیج ہے جو تخلیقی زمین میں بیچہ اور راس جنین کی صورت نمو پاتے ہی ایک اسلوب میں ڈھلنے لگتا ہے۔ لیجیے انفرادیت کا ایک اور زینہ طے ہوا۔ یہ زینے یہاں ختم نہیں ہوتے۔ جوں جوں آپ آگے بڑھتے جائیں گے مختلف ہوتے چلے جائیں گے اور آخر کار آپ کی اپنی تخلیقی شخصیت اپنی پوری قامت کے ساتھ ظاہر ہو جائے گی۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں پر یہ جو دیوانگی کی پھبتی کسی جاتی ہے یا انہیں اپنی سماجی تشکیل سے ہٹ کر چلنے والے اور 'خبط عظمت' میں مبتلا اشخاص کے طعنوں اور مہنوں کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ ان کا تخلیقی عمل سماجی تشکیل کا پابند نہیں ہوتا اسے توڑنے، پیسنے، گوندھنے اور اپنے تخلیقی وجود کے چاک پر ایک اچھوتی صورت میں ڈھال لینے کا پابند ہوتا ہے۔ یہ پابندی ہی تخلیقی عمل کی آزادی ہے اور اس آزادی کو کام میں لا کر ہی ایک اعلیٰ فن پارے کی تخلیق ممکن ہو پاتی ہے۔

12۔ آپ کی تحاریر کے بنیادی موضوعات کیا ہیں؟

محمد حمید شاہد: کسی بھی تخلیق کار کے ہاں اس کی تخلیق کا

بنیادی موضوع زندگی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہاں انسان ہی بنیادی حوالہ ہوتا۔ انسان جو کائنات کے اندر ہے اور نئے زمانے میں اسے مرکز سے حاشیے پر دھکیلا جا رہا ہے۔ افسانہ لکھتے ہوئے میرے پیش نظر کوئی گرما گرم موضوع نہیں ہوتا بلکہ وہ صورت حال ہوتی ہے جس میں کرداروں کو جھونک دیا گیا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ کوئی نہ کوئی موضوع خود بخود متن کا حصہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ میرے لیے کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جو ممنوعہ علاقے میں جا پڑتا ہو۔ شاید یہی سبب رہا ہوگا کہ احمد ندیم قاسمی نے میرے افسانوں کو لمحہ رواں کی معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی تاریخ کا درجہ دے دیا اور ڈاکٹر اسلم فرخی میرے افسانوں کے بارے میں کہا کہ یہ خوب صورت ہمہ جہتی انداز اور فکر کا آئینہ دار ہیں۔ میں وہ خوش بخت ہوں جسے انتظار حسین نے نئے افسانے کی آبرو کہا۔ حال ہی میں میرے افسانوں پر بات کرتے ہوئے محمد سلیم الرحمن صاحب نے میری روش کو حقیقت پسندانہ کہا مگر ایسی حقیقت پسندانہ جو پرانی وضع کی حامل نہیں اور جس میں جدیدیت کی ایسی روکار فرما ہے جو پرانی یا ترقی پسندانہ فکر سے بہت دور اور بہت مختلف ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کے خیال میں میرے افسانوں کی ایک بڑی صفت ان کے موضوعات کا تنوع ہے۔ اور اسے فاروقی صاحب نے میری بڑی کامیابی کہا ہے کہ میرے افسانوں میں ایسے موضوعات بیانیہ میں بے تکلف آجاتے ہیں جن کے بارے میں زیادہ تر افسانہ نگار گومگو میں مبتلا ہوں گے کہ فکشن کی سطح پر ان سے کیا معاملہ کیا جائے۔ ناقدین اور فکشن نگاروں کی ان آرا سے خود ہی اندازہ لگا لیجیے کہ میرے ہاں تخلیقی عمل کی کیا صورت بنتی رہی ہے اور کون سے موضوعات ان تخلیقات میں متن ہوتے رہے ہیں۔

13۔ اپنی ذاتی زندگی اور جائے پیدائش و رہائش کے بارے میں کچھ بتائیے۔

محمد حمید شاہد: ضلع اٹک کی ایک تحصیل ہے پنڈی گھیب۔ اسی کے محلہ ملکاں میں ہمارا گھر تھا۔ وہیں 23 مارچ 1957 کو پیدا ہوا۔ اس شہر کے محلہ مولا میں ایک سرکاری سکول تھا، اس میں پانچویں تک پڑھا۔ میٹرک تک بھی اسی شہر کے مڈل اور ہائی سکول تک تعلیم پائی۔ میٹرک کے بعد زرعی یونیورسٹی فیصل آباد پہنچ گیا باقی تعلیمی مراحل وہیں طے کیے۔ اپنی پہلی کتاب ''پیکر جمیل'' اسی زمانے میں لکھی۔ کہہ لیجیے میرا ادبی جنم فیصل آباد میں ہوا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو بینک میں ملازم ہوگیا۔ مختلف شہروں میں تعینات رہا اور آخر کار اسلام آباد میں پوسٹنگ ہوگئی۔ ریٹائر ہوا تو اسلام آباد ہی میں سکونت اختیار کر لی کہ اس عرصہ میں یہیں گھر بنا لیا تھا۔

14۔ اگر آپ ادیب نہ ہوتے تو۔۔۔۔؟

محمد حمید شاہد: اگر میں ادیب نہ ہوتا تو مصور ہوتا۔ یونیورسٹی کے زمانے میں، میں اسی کی طرف راغب بھی رہا مگر یہ شوق بہت مہنگا نکلا۔ ایزل پر ادھورا کام کئی کئی ماہ ٹنگا رہتا کہ مطلوبہ رنگ اور برش خریدنے کو پیسے نہ ہوتے تھے۔ میں کڑھتا رہتا اور سکون کے لیے کتابوں کے مطالعے میں جت جاتا۔ یوں مصوری مجھ سے چھوٹ گئی اور کتاب سے تعلق مستحکم ہوتا چلا گیا۔

15۔ پسندیدہ شعرا اور شاعر کون ہیں؟

محمد حمید شاہد: بہت سے ہیں۔ پرانے بھی نئے بھی۔ میر تقی میر نے کیا خوب کہا تھا

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

تو یوں ہے کہ اردو شاعری کی روایت بہت شاندار اور مستحکم ہے یہاں میرے محبوب کئی ہیں کہ ہر کوئی اپنی الگ ادا رکھتا ہے۔ ایک شعر جمال احسانی کا بھی عرض کیے دیتا ہوں:

اس رستے پر پیچھے سے اتنی آوازیں آئیں جمال
ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھے پاؤں کی

جب جب مجھ سے کسی ایک پسندیدہ شاعر یا کسی پسندیدہ شعر کی بابت پوچھا جاتا ہے اور میں اردو کی عظیم شعری روایت کی شاہراہ بنانے والوں کا سوچتا ہوں تو وہی کیفیت ہوتی ہے جو جمال احسانی کے اس شعر میں ہے کہ ایک نہیں کئی آوازیں متوجہ کرتی ہیں اور ہر آواز پر توجہ دینے کے لیے پورا وجود گھوم کر رہ جاتا ہے۔

16۔ زندگی کا خوبصورت اور یادگار لمحہ کون سا تھا؟

محمد حمید شاہد: زندگی کے خوب صورت اور یادگار لمحات تو کئی ہیں اور میں ایسا خوش بخت ہوں جس کی زندگی میں یہ سنہری لمحات تواتر سے آتے رہے ہیں۔ مجھ پر زندگی کی عنایات بہت ہیں جس پر جتنا بھی خدا کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ حال ہی کا ایک واقعہ دیکھیے۔ میں دل کا مریض ہو کر ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹروں نے بائی پاس سرجری کا کہہ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جتنا جلدی ممکن ہو پراسس کروا لیجیے ورنہ خطرہ بہت ہے۔ میری نصف بہتر یاسمین کا مرجھایا ہوا چہرہ مجھے بہت کچھ بجھا رہا تھا۔ یہ خطرہ ظاہر ہے میری جان کو ہوسکتا تھا۔ ابھی میں ہسپتال میں تھا اور مجھے ڈاکٹر بستر سے نیچے پاؤں دھرنے سے بھی منع کر رہے تھے کہ اسی ہسپتال کے لیبر روم میں میرے بیٹے سعد کی دلہن سمیعہ کے ہاں پہلی ولادت ہوئی۔ یہ سب کچھ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں اپنی بیماری اور اس باب میں ڈاکٹروں کی باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ ایک ننھا منا وجود کپڑے میں لپٹے ہوئے میری بیٹیاں سامنے آئیں اور کہا: ''بابا جان! دادا بننا مبارک ہو۔'' میں نے ننھی بچی گود میں لی تو مجھے لگا جیسے زندگی جست لگا کر آگے بڑھ رہی ہو۔ مجھے زندگی سے اور کیا چاہیے تھا؟ عین اُس لمحے مجھے لگا کہ زندگی کی سب سے بڑی عطا میری بانہوں میں تھی۔ میرا دل خوشی اور اطمینان سے بھر گیا اور بیٹے سعد سے کہا: میں سرجری کے لیے تیار ہوں۔

انٹرویو: فہیم ضیاء

سوال ۱۔ سب سے پہلے اپنے سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے

جواب، میرے آباواجد نے اقیام پاکستان کے وقت د ہندوستان (سونی پت) سے ہجرت کر کے پاکستان (خانیوال) آئے کر۔ میری پیدائش خانیوال میں ہوئی۔ خانیوال کے گلی کوچوں میں کھیلتے کودتے جوان ہوگئے ،۔ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں میں ہی حاصل کی بہاء الدین زکریہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو پاس کیا۔

سوال نمبر۲۔ عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا

جواب۔ عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کیا، سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں تعلیمی خدمات انجام دیں آجکل بیرون ملک مقیم ہوں اور پاکستان سکول عمان (مسقط) میں بطور اردو معلم اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں

سوال نمبر۳۔ ادب سے شوق کی ابتداء؟

جواب۔ کالج کے زمانے میں غیر نصابی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا آہستہ آہستہ نثر لکھنے لگا اور شعر کہنے لگا،

سوال نمبر۴۔ اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے

جواب میری دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک سنجیدہ غزلوں پر مشتمل ہے جس کا نام ''قسم لے لو محبت ہے'' اور دوسری مزاحیہ شاعری پر مشتمل ہے جس کا نام ہے'' بچہ جمورا''۔ ''قابوس کی جنت'' (سفرنامہ عمان) اور نعتیہ مجموعہ، اخباری کالموں کا مجموعہ تصنیف کے مراحل سے گزر چکا ہیں۔ لیکن، ذاتی مصروفیت کی وجہ سے ان کتابوں کی اشاعت ممکن نہیں ہو رہی۔ امید ہے اس برس یہ کتابیں ''اشاعت'' کا پل صراط عبور کر لیں گی۔

سوال نمبر۴ آپ نثر نگار بھی ہیں شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر

جواب۔ شاعری اور نثر دونوں اظہار کے وسیلے ہیں، مجھے دونوں یکساں مرغوب ہیں۔ میرے خیال میں موضوع اور اس کے حجم کو سامنے رکھ کر ہی وسیلہء اظہار کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ایک صنف سخن تمام موضوعات کا احاطہ نہیں کر پاتی اس لیے آپ کو اظہار کے لیے مختلف اصناف سخن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ موضوع کو بہتر اور موثر انداز میں بیان کرنے کے لیے ہر کوئی مختلف اصناف سخن کا سہارا لیتا ہے میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں

سوال نمبر ۶ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جاتا ہے

جواب، یہ بات سو ہان روح ہو چلی ہے۔ لوگوں نے بڑی ''رغبت'' سے کتاب بینی ترک کی ہے۔ میں تو یہاں بھی کہوں گا کہ ریاست جب جرائم کی روک تھام کے لیے اخبارات میں تاکیدی اشتہارات دے سکتی ہے۔ تو معاشرے میں بڑھتے ہوئے بگاڑ کو روکنے، تحمل و برداشت کو فروغ دینے اور، تہذیبی و ثقافتی قدروں کی نمو، کے لیے، الیکڑونک و پرنٹ میڈیا کے ذریعے کتاب بینی کو فروغ کیوں نہیں دیتی۔ ریاست عوام کے ذوق سلیم کو بہت تھوڑے وقت میں اور بہت بہتر انداز میں پروان چڑھا سکتی ہے جس طرح ہمارا الیکڑانک و پرنٹ میڈیا کھلاڑی کو پروموٹ کرتا ہے اگر لکھاری کو پروموٹ کرے تو لوگ کتاب کی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ بطور مسلمان کتاب سے، علم سے، حرف سے دانائی سے جتنا تہذیبی و تاریخی رشتہ ہمارا ہے شاید کسی دوسری قوم کا نہ لیکن پھر بھی ہم کتاب سے دور ہو گئے ہیں

سوال نمبر۹۔ تخلیق کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد ہے؟

جواب۔ میرے خیال میں اچھی تخلیق کی عمارت کئی ستونوں پر ایستادہ ہوتی ہے اچھی تخلیق وہی ہے جس کو حقیقت سے کشید کیا گیا ہے۔ تخلیق میں جمالیاتی اوصاف بدرجہ اتم موجود ہوں۔ قارئین کے معروضی حالات سے مطابقت رکھتی ہو، ابلاغ ہو، خیال کی بلندی، خیال کی ندرت، وغیرہ وغیرہ

سوال نمبر۱۰۔ کوئی بے حد آسودہ وقت تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی

جواب۔ زندگی کی منڈیر پر دھوپ چھاؤں آتی رہتی ہے۔ زندگی کرنا مشکل کام ہے۔ کم وبیش ہر شخص زندگی میں سخت محنت اور جدوجہد کے عمل سے ضرور گزرتا ہے۔ لیکن خدا کبھی کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا، زندگی میں، میں نے بھی کچھ عرصہ محنت اور جدوجہد کی۔ لیکن اب خدا کا کرم ہے۔ اس نے اپنی بے بہا نعمتیں سے نوازا ہوا ہے۔ میرے خیال میں تخلیقی آسودگی کے لیے یک سوئی ہونا لازم ہے۔ اور یک سوئی ذہنی اطمینا ن سے کشید ہوتی ہے۔ یہ ذہنی اطمینان معاشی خوشحال، جسمانی صحت اور کئی دیگر چیزوں سے جنم لیتا ہے۔

سوال نمبر۱۱۔ مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے، آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ سے مطمئن ہیں

جواب۔ آپ مشاعروں کی بات کرتے ہیں ہماری تو پوری تہذیبی و ثقافتی زندگی پر زوال آیا ہوا ہے۔ افسوس

اس بات کا ہے کہ تہذیبی وثقافتی زندگی کے زوال کے آگے کبھی کسی حکومت نے بند باندھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر ریاست چاہتی تو بہت کچھ کرسکتی تھی، اور کرسکتی ہے لیکن بدقسمتی سے حکومت کی ترجیحات میں ثقافتی قدروں کی نمو نہیں ہے۔۔ میرے خیال میں ریاست جس طرح جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے ایسے ہی ریاست کو ثقافتی قدروں کی بھی حفاظت کرنی چاہے۔ وقتاً فوقتاً ضلعی سطح پر حکومتی سرپرستی میں مشاعروں کا انعقاد ہونا چاہے۔ یہ مشاعرے ہماری روشن روایت کا درخشندہ باب ہے ادبی تنظیموں نے مشاعروں کی روایت کو زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن ان ادبی تنظیموں سے وابستہ لوگ بھی گھر بار والے تھے آخر کب تک ذاتی جیب سے مشاعروں کا انعقاد کرتے سو آج مشاعرہ ہونا ایک خبر بن گیا ہے۔ مشاعروں کا مسلسل بنیادوں پر نہ ہونے کی وجہ نئی نسل کے ذوق سلیم کی تربیت نہیں ہو پائی، جس کی وجہ سے نئے، سنجیدہ نوجوان سامعین ادبی نشستوں میں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ خطرناک صورت حال ہے۔ اگر نئے لکھنے والے آرہے ہیں تو نئے پڑھنے والے اور سننے والے بھی آنے چاہئیں۔ اچھے سامعین ہی مشاعرہ کا حسن ہیں۔

سوال نمبر۱۲۔ کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے معاشرے سے؟ یا اندرون سے

جواب۔ میرے خیال میں ایک اچھا تخلیق کار اپنے تخلیق کے موضوعات معاشرے سے کشید کرتا ہے۔ معاشرے میں جا بجا پھیلی احساسی محرومی، سماجی منافقت، اہل زر کی توقیر، معاشرتی استحصال، معاشی ناہمواریاں، سماجی جبر، غربت وافلاس جہالت، معاشرتی طبقات، کو جب دیکھتا ہے تو ایک تخلیق کار اندر ہی اندر کڑنے لگتا ہے، یہی کرب اس کو تخلیق کی منزل تک لے جاتا ہے۔ منزل پر پہنچ کر تخلیق کار ان موضوعات کو اپنی عینک سے دیکھتا ہے، اپنے نظریہ سے سوچتا ہے، اور تحریر کو اپنا اسلوب عطا کرتا۔

سوال نمبر۱۳۔ آپ ادب کے فروغ سے سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

سوال نمبر۱۴۔ ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

جواب۔ میرے خیال میں عمیق مشاہدہ، گہرا مطالعہ ذاتی تجربہ اور مسلسل، ریاضیت، ہی اچھی تخلیق کی اساس ہے۔ لیکن آج کل بیشتر نئے تخلیق کار اپنی تئیں مشق سخن تو ضرور کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں مطالعہ کی شدید کمی ہے۔ رجحان ساز شاعروں کا سنجیدہ اور مسلسل مطالعہ نئے لکھنے والوں کو نہ صرف اعتماد دیتا ہے بلکہ نئی منزلوں کی بشارت بھی دیتا ہے۔ ا۔ حقیقت نگاری تخلیق کو نئی بلندیاں عطا کرتی ہے سے۔ آپ کسی بھی نظریہ فن کے قائل ہوں مسلسل محنت، ریاضیت، عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ ہی تخلیق کو چار چاند لگاتا ہے۔

سوال نمب ر۱۵۔ کیا کھویا کیا پایا؟

جواب۔ خدا کی رحمتیں ہمیشہ شامل حال رہیں خدا نے مجھے میری حیثیت، ضرورت اور قابلیت سے زیادہ عطا کیا ہے۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے حرف لکھنے اور شعر کہنے کی نادر صلاحیت عطا کی۔ لاکھوں لوگوں میں منفرد مقام عطا کیا۔ قدم قدم پر شاعری کی بدولت عزت وتکریم ملی، حرف لکھ کر اطمینان قلب ملا۔

محمد سلیم ساگر/ لاہور

جہاں جہاں کوئی تجھ سا دکھائی دیتا ہے
مگر کہاں کوئی تجھ سا دکھائی دیتا ہے
میں دونوں ہاتھ ملاتا ہوں جب دعا کے لیے
تو درمیاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
وہاں، وہاں کوئی مجھ سا بھی لازمی ہوگا
جہاں، جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
جہاں جہاں بھی کوئی دیکھنے کی صورت ہو
وہاں وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
رگوں میں دوڑتے اک سرخ اضطراب کے ساتھ
رواں دواں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
ذرا شبیہ سے ملتی تو ہو شبیہ کوئی
کہاں کہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

.....

کوئی ایسا بھی خوبصورت ہو
جس کا سایہ بھی خوبصورت ہو
وقت یکساں خراج لیتا ہے
کوئی کتنا بھی خوبصورت ہو
تجھ سے بڑھ کر نہ ہو اگر کوئی
بے تحاشا بھی خوبصورت ہو
تجھ کو بھیجا گیا ہے دنیا میں
تاکہ دنیا بھی خوبصورت ہو
خوبصورت وہی نہیں جو ہے
بلکہ لگتا بھی خوبصورت ہو

مری والے

پروفیسر عاصم بخاری/میانوالی

منصف خان پاکستان کا ہم عمر تھا۔ جہاں دیدہ تھا۔ دسمبر کی ٹھٹھرتی رات میں نہ جانے اس کی نیند کیوں اڑ گئی۔ سب گھر والے گہری نیند سو رہے تھے مگر منصف خان کو کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں موجود چیزوں پر غور کرنے لگا۔ سوچتے سوچتے ماضی میں بہت دور جا نکلا۔ وووہ۔۔۔ تقسیم پاکستان کے وقت کے لوٹ مار کے بزرگوں سے سنے قصے قتل وغارت یاد آئی بے چینی یاد آئی تو آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تو۔۔۔ سیلاب یاد آ گئے۔ سیلابوں کی تباہ کاریاں، بے گھر ہوتے لوگ،۔۔۔ بے سروسامانیاں اور مدد گاروں کے روپ میں آنے والوں کی مہربانیاں یاد آ گئیں۔

کس نے لوٹا کس طرح سے یہ کہانی پھر سہی
وہ تو بے گھر ہو گئے مگر مددگار عالی شان گھروں میں جا بسے۔ جس کا کبھی سوچا تک نہ تھا۔ جنہیں سیلاب نے بے سروسامان کیا وہ کبھی نہ سنبھل سکے۔ اداسی بڑھ گئی۔ خاموشی میں گھڑی کی ٹک ٹک نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دیکھا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ واش روم گیا۔ واپس پھر بستر پر لیٹ گیا۔ کوشش بہت کی چراغ بھی گل کر دیا۔ منہ پر کپڑا ڈال دیا آنکھیں بند کیر لیں۔ کروٹیں بدلیں مگر نیند نہ جانے کدھر کھو گئی۔

ذہن میں بھونچال سا آیا۔ زلزلے کا خیال آیا۔ وہ کربناک مناظر زلزلے کے شدید جھٹکے، فلک بوس عمارتوں کا زمیں بوس ہونا، لوگوں کا مکانوں کے ملبے تلے دب جانا۔ آہیں چیخیں سسکیاں مدد کی پکاریں ،سکولی بچے۔۔۔ سب دب گیا۔ مددگاروں سے پہلے ،مددگاروں کے روپ میں درندہ صفتوں کا پہنچنا دبے ملبے سے زندہ عورتوں کی سونے کی چوڑیوں والی کلائیاں خنجر سے کاٹ کے اپنے بیگوں میں محفوظ کرنا یاد آیا دل کو اور افسردہ ہو گیا کہ اچانک لاشعور نے گاڑیوں کے حادثے کی زوردار آواز سنائی۔ زخمیوں کی فریادیں، مدد کی پکاریں مدد کے نام پر بھاگ کر پہنچنے والوں کا مر جانے اور زخمیوں کے موبائیل فون اور پرس سنبھال کر دوسروں کو اشارہ کرنا کہ یاران کو سنبھالو، نکالو ان کی حالت بہت خراب ہے اور خود چلتے بننا۔

نماز شب کا وقت ہو گیا۔ نماز شب ادا کی تو ذہن میں رمضان المبارک اور سحری کا وقت یاد آیا۔ تحت الشعور سے صدا آئی مہنگائی ہو گئی ہے لگتا ہے رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے۔ آخری روزے آئے تو عید کے لیے گھر جانے والے پردیسیوں سے سفری گاڑیاں چھپا کر مصنوعی قلت کے ذریعے منہ مانگے کرائے نظر آئے تو محسوس ہوا کہ شاید عید قریب ہے۔

بے چینی مزید بڑھی تو ٹی وی آن کیا مری میں برف باری دیکھنے جانے والوں کی برف میں بری پھنس اور دھنس جانے کی خبریں چل رہی تھیں۔ کہ دم گھٹ کر گاڑیوں میں مر گئے۔ ہوٹل مالکان نے خود غرضی اور سفاکی، کی حد کر دی ہے۔ صرف ہوٹل والے ہی نہیں، جس کا جتنا اور جہاں بس چلا۔۔۔ متعدد لوگ مر گئے ہیں۔ موذن نے صبح کی اذان شروع کی اللہ اکبر۔۔۔

منصف خان بستر سے اٹھا، لمبی سرد آہ بھری اور صرف ایک ہی جملہ کہا۔

مری والے۔۔۔

ہم
سب مری والے
ہم ہیں عاصم سبھی مری والے
دیر ہے صرف برف پڑنے کی

مختصر ادبی خبریں (مرتبہ: محمد ممتاز راشد لاہوری)

وفیات:

❁ ممتاز ادیب، ممتاز شیخ 4 فروری کو فوت ہوئے۔ وہ ادبی رسالہ ''لوح'' کے مدیر اعلیٰ تھے۔

❁ برصغیر کی نامور ترین گلوکارہ لتا منگیشتر 6 فروری کی صبح فوت ہوئیں۔ ان کی عمر 92 سال تھی۔

❁ مسٹر ایشیا یحییٰ بٹ کا انتقال 5 فروری کو لاہور میں ہوا۔ انہوں نے لاہور میں جدید انداز کے تین ''جم'' بھی قائم کیے۔ نماز جنازہ ای ایم ای سوسائٹی لاہور میں ادا ہوئی۔

❁ نامور افسانہ و ناول نگار اور کالم نگار بشریٰ رحمٰن سات فروری کو دوپہر کے وقت لاہور میں فوت ہوئیں۔ ان کی نماز جنازہ احمد بلاک گارڈن ٹاؤن لاہور میں ادا ہوئی۔

❁ بزرگ شاعر روحی کنجاہی کی وفات سات فروری کو رات کو لاہور میں ہوئی۔

❁ سینئر صحافی عاشق جعفری گیارہ فروری کو لاہور میں فوت ہوئے۔

❁ معروف شاعر سید راشد عارف (سانگلہ ہل) 14 فروری کو فوت ہوئے۔

❁ معروف انڈین راک سٹار موسیقار اور گلوکار بھپی لہری 69 برس کی عمر میں 16 فروری کو فوت ہوئے۔

❁ بانی ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور چودھری برکت علی کے بیٹے ظفر علی چودھری 18 فروری کو فوت ہوئے۔

❁ بزرگ صحافی اور کالم نگار رفیق ڈوگر 21 فروری کو لاہور میں فوت ہوئے۔ اُسی روز قاضی عابد نے بھی وفات پائی۔ وہ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں صدر شعبہ اُردو تھے۔

❁ بزرگ شاعر نذر ساجد 22 فروری کو خان گڑھ میں فوت ہوئے۔ اللہ انہیں روح کی آسودگی بخشے۔

مختصر ادبی خبریں

❁ مجلس ترقی ادب کے صدر منصور آفاق نے دس فروری کو ''ادبی چائے خانہ'' مال روڈ لاہور میں شکیل جاذب کے اعزاز میں مشاعرہ رکھا۔ نظامت: خالد ندیم شانی، شعراء و شاعرات: عباس تابش، ڈاکٹر اختر شمار، ممتاز راشد لاہوری، حسنین سحر، مجید سالک (وہاڑی)، باقر علی شاہ، ڈاکٹر غافر شہزاد، شفیق احمد خاں، افضل پارس، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، عزیر احمد، اظہر عباس، ڈاکٹر دانش عزیز، زاہدہ جبیں راؤ، صابر انصاری (ملتان)، اعجاز ثاقب، احسان الحق مظہر، کنور عبدالماجد، اکمل حنیف، تسنیم بخاری، آصف انصاری، جی ایم ساقی اور دیگر کئی شرکاء میں مدیر ''بیاض'' نعمان منظور بھی تھے۔

❁ بزم کتاب دوستاں کے زیر اہتمام معروف شاعر تاثیر نقوی کے شعری مجموعے ''ساحل پہ کھڑے لوگ'' کی تقریب پذیرائی کتاب ورثہ کے دفتر میں ہوئی۔ جن شعراء نے کتاب کے حوالے سے گفتگو کی ان میں باقی احمد پوری، اقبال راہی، اعجاز رضوی، ناصر بشیر، مظہر سلیم مجوکہ، آفتاب خان، یٰسین رضا، ایوب عافی، فراست بخاری، محمد عارف اور نجمہ شاہین شامل ہیں۔ آخر میں میزبان مظہر سلیم مجوکہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

❁ برطانیہ سے آئے ہوئے شاعر سرفراز تبسم کے شعری مجموعہ ''ہاتھوں میں آسمان'' کی تقریب دس فروری کو اکادمی ادبیات اپر مال لاہور میں ہوئی۔ صدارت: نذیر قیصر، نظامت: آفتاب جاوید، میزبان: ریاض احمد احسان اور چودھری محمد عثمان کاہلوں۔ مقررین: ڈاکٹر ایم ابرار، ڈاکٹر نعیم سلیم، فراست بخاری، محمد جمیل، گلدستے پیش ہوئے، کتابوں کے تحفے دیے گئے۔ نمایاں شرکاء: آسناتھ کنول، یونس کھوکھر، عرفان گجر، ڈیوڈ پرسی، آصف عمران، ارمان ہاشمی (جھنگ)، فہیمہ خالد، شاہد اشرف اور دیگر کئی۔ شعری دور بھی ہوا۔

❁ ویلنٹائن ڈے (یوم محبت) 14 فروری کو منایا جاتا ہے مگر اہل قلم کا اس حوالے سے ایک اجتماع 16 فروری کو مجلس ترقی ادب کے ادبی چائے خانہ (مال روڈ) لاہور میں ہوا۔ ظہرانہ کے لیے سبھی اپنے ساتھ کھانا لائے۔ چائے مجلس ترقی ادب کی طرف سے پروفیسر شفیق احمد خاں نے پلا دی۔ اس محفل کی محرک معروف افسانہ نگار سلمیٰ اعوان اور نیلم احمد بشیر تھیں۔ دیگر شرکاء تھے: پروین ملک، حسین مجروح، ڈاکٹر اختر شمار، ممتاز راشد لاہوری، پروفیسر ناصر بلوچ، سیما پیروز قاضی، فرحت زاہد، رخشندہ نوید، ڈاکٹر غافر شہزاد، فرحت پروین، ڈاکٹر فوزیہ تبسم، ڈاکٹر عظمیٰ سلیم، آفتاب خان اور دیگر۔ ظہرانے کے بعد کچھ نے اپنی شاعری سنائی اور کچھ نے اپنی پسند کے نغمے۔ آخر میں حال ہی میں وفات پانے والے قلمکاروں بشریٰ رحمٰن، روحی کنجاہی اور ساجد گل کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

❁ 19 فروری کو آیان پیلس بحریہ ٹاؤن لاہور میں ماہانہ مشاعرہ ہوا۔ صدارت: نذیر قیصر، مہمانِ اعزاز: ڈاکٹر مدثر جاوید ملک (ملتان)، نظامت تقریب کے میزبان اکمل حنیف نے کی۔ دیگر شعراء: محمد عباس مرزا، ممتاز راشد لاہوری، یونس فریدی، اوصاف شیخ، رخسانہ سحر، شاہد اشرف، ثقلین جعفری، بدر سیماب، سید زاہد شہزاد، آصف جاوید، فہیمہ خالد، شہیر تہامی، سجاد احمد سجاد، حافظ صادق فدا اور میزبان اکمل حنیف۔

❁ فرخ سہیل گوئندی کے سفرنامہ ''میں ہوں جہاں گرد'' کی تقریب رونمائی 19 فروری کو مکاتب خانہ۔ شاہی قلعہ لاہور میں ہوئی۔ متعدد مقررین نے اظہار خیال کیا۔ نظامت: ماریہ اقبال ترانہ۔

عاطف جاوید عاطف کے شعری مجموعہ ''ہمیں تو حکم مجاوری ہے'' کی تقریب رونمائی 20 فروری 2022ء کو ادبی چائے خانہ (مجلس ترقی ادب) مال روڈ لاہور میں زیر صدارت ڈاکٹر اختر شمار منعقد ہوئی۔

❁ پندرہ جنوری کو کاسمو کلب لاہور میں ''جگنو انٹرنیشنل'' کے تحت رضوانہ سحر ہاشمی کے تیسرے شعری مجموعہ ''کس قدر تنہائیاں ہیں'' کی تقریب ہوئی۔ صدارت: ڈاکٹر اختر شمار، مہمانانِ خصوصی: اختر ہاشمی، ممتاز راشد لاہوری، پروفیسر مسرت کلانچوی اور جاوید شیدا۔ نظامت: ایم زیڈ کنول۔ اظہار خیال: شگفتہ غزل ہاشمی، خالدہ نقاش، فیاض ظفر، عالیہ بخاری ہالہ، کامران نذیر، پروین وفا ہاشمی، فراست بخاری، بابر ہاشمی، ڈاکٹر نوشین خالد۔

❁ گیارہ جنوری کو کاسمو کلب گل آشیانہ ویلفیئر فاؤنڈیشن لاہور کی ایوارڈز تقریب۔ صدارت: راشد محمود، مہمانانِ خصوصی: حسیب پاشا، افتخار بخاری۔ میزبان: بیگم شہزاد منیر، ایوارڈ یافتگان: توقیر بن اسلم، گلوکار نثار بھٹی، اعظم منیر، میاں صلاح الدین ایڈووکیٹ اور دیگر۔ نمایاں شرکاء: ممتاز راشد لاہوری، شہزادہ علی ذوالقرنین، حفیظ شاہ اور دیگر کئی۔ نظامت: عزیز شیخ۔

❁ 16 جنوری کو پلاک میں برٹش آرٹس کونسل اور سیوا آرٹس نے ڈاکٹر صغیر احمد صغیر کے مجموعہ غزل ''مرا تو ہے'' کی تقریب اور مشاعرہ منعقد کیا۔ صدارت: حسین مجروح مہمانانِ خصوصی: غلام حسین ساجد، محمد عباس مرزا، ڈاکٹر جواز جعفری، کرامت بخاری، نظامت: ڈاکٹر دانش عزیز، میزبان: عرفان صادق، علی صدف۔ منظوم خراج تحسین: افضل پارس، عرفان صادق۔ دیگر شعراء شاعرات: ممتاز راشد لاہوری، سید ضیا حسین، ریاض رومانی، رضا عباس رضا، زاہدہ جبیں راؤ، اسد اللہ ارشد میو، میڈم رجب چوہدری (سیالکوٹ)، سمیرہ ساجد (نارروال)، نائیلہ عابد، سیدہ تسنیم بخاری، محمد صدیق جوہر، اکمل حنیف، آصف انصاری، لیاقت علی میو، اظہر عباس اور دیگر۔

❁ 22 جنوری کو ڈرامہ نگار توقیر بن اسلم نے وحدت روڈ لاہور پر واقع میوزک اکیڈمی میں محفل ادب اور محفل موسیقی سجائی۔ کلام سنانے والوں میں ممتاز راشد لاہوری، میاں صلاح الدین ایڈووکیٹ اور توقیر بن اسلم تھے۔ گلوکاروں میں نجیب اسلم خاں، نثار بھٹی، ہمابٹ، باجوہ، شہزاد ملک اور دیگر شامل تھے۔ موسیقار میاں شہریار نے خصوصی شرکت کی۔

❁ ادارۂ خیال وفن کے زیر اہتمام 25 جنوری کو اکادمی ادبیات اپر مال لاہور میں ادب کے نونہالوں کے اعزاز میں ایک تقریب ہوئی۔ صدارت: ایم زیڈ کنول صاحب، مہمانِ خصوصی: مونا ثانی اور محمد جمیل، نظامت: ممتاز راشد لاہوری۔ بانی وصدر ادارۂ خیال و فن دیگر شرکاء: نائیلہ عابد، جواد راسخ، نواب برکات محمود، متعدد نونہالانِ ادب اور دیگر کئی۔

❁ والنٹیر آرٹ فاؤنڈیشن نے وحدت روڈ (نزد آبپارہ مارکیٹ) کے اپنے مرکز میں 5 فروری کو یومِ کشمیر منایا۔ میزبان تھے: توقیر بن اسلم، شاہین بھٹی ایڈووکیٹ، نرگس ناہید ایڈووکیٹ، میاں صلاح الدین ایڈووکیٹ، ناہید باجوہ، بیگم شہزاد، نعیم بٹ، نازیہ بٹ اور متعدد دیگر۔

❁ فروری کو ڈی ایچ اے لاہور میں ایرج مبارک کے ہاں حلقہ فنون لطیفہ کے زیر اہتمام انتظار حسین کی چھٹی برسی پر خصوصی نشست ہوئی۔ نظامت: ڈاکٹر طفیل۔ مقررین: ممتاز راشد لاہوری، نیلم احمد بشیر، ریاظ احمد، پروفیسر شفیق احمد خاں، پروفیسر جواد احمد، حافظ جنید رضا اور دیگر۔ دیگر شرکا: ڈاکٹر غافر شہزاد، ڈاکٹر شاہدہ دلاور، نائیلہ عابد، محمد احمد، توصیف شہزاد احمد اور دیگر۔

❁ اکرام چغتائی کا ماہانہ مشاعرہ 6 فروری کو بیت محمد علی صابری (ہما بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں ہوا۔ صدارت: سعد اللہ شاہ، مہمانانِ خصوصی: اعجاز منظور عادل اور ندیم شیخ۔ دیگر شعراء: ممتاز راشد لاہوری، محمد علی صابری، پروفیسر فرخ محمود، فرہاد ترابی، وسیم عباس اور ناظم مشاعرہ افضل ساجد۔

❁ اندرون موچی دروازہ لاہور کے معروف شاعر فدا حسین فدا کی سولہویں برسی پر نعتیہ مشاعرہ آٹھ فروری کو اکادمی ادبیات لاہور میں ہوا۔ صدارت: عباس تابش۔ مہمانِ خصوصی: پروفیسر عاشق رنیل، اختر حسین قریشی، محمد اکرم قلندری۔ نظامت: عباس رضا نقوی، میزبان طاہر ابدال طاہر، (ابن فدا حسین فدا)۔ شعرائے کرام: الحاج رفیع الدین ذکی قریشی، ممتاز راشد لاہوری، عدل منہاس لاہوری، طاہر ناصر علی، ہمایوں پرویز شاہد، طفیل اعظمی، عالیہ ہالہ، میاں صلاح الدین، فراست بخاری، ریحانہ شبیر، نرگس نور، نجمہ شاہین، نرگس رحمت، امجد رسول امجد، جی ایم ساقی، محمد جمیل۔

بزم پرنم رجسٹرڈ پاکستان کے زیر اہتمام

محفل سماع و تقسیم گولڈ میڈل

3 مارچ بروز جمعرات 4 بجے ہمدرد ہال لٹن روڈ پر منعقد ہوگی جس میں ملک کے نامور قوال اور نعت خواں حضرات شریک ہوں گے

زیر انتظام:

محمد اقبال پیام بانی و چیئرمین بزم پرنم رجسٹرڈ

نامہ ہائے احباب

مٹھاس بھرے لہجے کے شاعر حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم۔ نئے سال کی مبارک باد "ارژنگ" وارد ہوا۔ ٹائٹل کے کیا کہنے جیسے آپ کی بات ویسے ٹائٹل کے پرندے کی باڈی لینگویج۔ اس پرندے کی مہربانی سے یہاں ایک غزل ہو گئی ہے۔ محترم انور شعور کا انٹرویو سدا بہار خیالات کا آئینہ ہے۔ انور شعور نے غزل کو حسرت، حیرت، فضیلت اور محبت کا ایسا فکری ماحول بخشا ہے کہ دیکھا چاہیے۔ ارژنگ میں انٹرویو کا سلسلہ بے ساختہ رنگ و آہنگ سے مزین ہوتا ہے۔ معروف شاعرہ لبنیٰ صفدر کا سفرنامہ "نظارہ آموز" ہے۔ پڑھنے والا ان کے "بال بچوں" کے ساتھ نکل کھڑا ہوتا ہے۔ دھن ہو تو من بھی موج کرتا ہے۔ من موجی اگر شاعر ہو تو رنگ ہی اور ہوتا ہے۔ جھیلوں میں پریوں کے اُتارے کا منظر ایک شاعر ہی آنکھوں کے رستے دل میں اُتار سکتا ہے۔ سفرنامہ خاصا دلچسپ ہے۔ قلم حروف کی روانی کے صدقے جا رہا ہے۔ اپنے دوست عبدالوحید بسمل کی غزل کی جدت طرازی خوب ہے۔ کچھ دن پہلے بسمل صاحب سے مظفر آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف آزاد کشمیر بینک مظفر آباد میں جوہر آزما ہیں۔ میں وہاں ایک مرحوم عزیز کے گھر گیا تھا۔ بسمل صاحب نے مارے پیار کے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ مجھے اور میرے ساتھ والوں کو مرغ و ماہی سے بھرپور چائے پلائی (ماہی روایتاً لکھ دیا ہے) خاکہ "ابو جی" بہت پسند آیا۔ شہزاد نیئر شعر بھی اچھے کہتے ہیں اور نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ "ابو جی" نے اشکوں کا طوفان بپا کر دیا ہے۔ چند برس پہلے شہزاد نیئر میری کتاب "در کنار" کی تقریب میں ایک دوست کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ اس وقت انہیں دیکھا تھا پھر دیکھنے کی حسرت ہے۔ یہی خوب ہے کہ ان کی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس "جگمگے" میں ارژنگ اپنے انداز سے نقش و نگار ترتیب دیتا ہے۔ یہ سٹائل خوب صورت ہے۔ شاعری کا حصہ شعری اسباب کا مجموعہ ہے۔ ارژنگ یہاں بھی اپنی روایات کی پاسداری کر رہا ہے۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

بوئی ہزارہ

محترم حسن عباسی صاحب!

سلام و آداب! "ارژنگ" (جنوری 2022ء) ہم دست و نظر نواز ہوا۔ حسب روایت دلچسپ تحریروں سے آراستہ تھا۔ عامر بن علی کی نامور شاعر انور شعور سے شعر اور گفتگو نے خوب محظوظ کیا۔ لبنیٰ صفدر نے لاہور سے اسلام آباد، چنگورہ (سوات) اور وادئ کالام کے اپنے سفرنامہ میں کیا جنت نظیر نظارے دکھائے ہیں۔ جمیل یوسف نے 95 سالہ جنرل عبدالمجید سالک آف چکوال کی سوانح عمری "ہم بھی وہاں موجود تھے" پر مفصل بات کی ہے اور باہمی اچھے تعلقات کے باوجود ان کی بعض کوتاہیوں پر تنقید بھی کی ہے، اس طرح یہ تجزیہ اور تبصرہ ایک محاکمہ بھی بن گیا ہے۔ آپ کے حمدیہ مجموعہ پر نسیم سحر کا مضمون بھی گراں قدر ہے۔ دیگر مضامین اور شاعری کے صفحات ابھی جستہ جستہ دیکھے ہیں۔ آپ نے میری ایک غزل بھی شائع کی ہے، آپ کا دلی شکریہ!! آپ نے میری ارسال کردہ "مختصر ادبی خبریں" بھی اس شمارے کا حصہ بنائی ہیں۔ اس کرم فرمائی پر بھی ممنون کرم ہوں۔

"ارژنگ" کے لیے نیک تمنائیں

خیر اندیش

ممتاز راشد لاہوری

بوئی ہزارہ

محبت مکرم حسن عباسی صاحب!

خلوص بے کراں۔ سال نو کا اولین شمارہ نظر نواز ہوا۔ یاد آوری اور جملہ عنایات کا شکریہ!! ارژنگ ظاہری اور باطنی خوبصورتی کا مرقع ہے۔ بامعنی اور بامقصد نثری تحریریں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ صفحہ نمبر ۲ پر آپ کی حمد اور "صاحب کا حوالہ" خاصا معنی خیز ہے۔ اسی صفحے پر جناب محمد امین ساجد سعیدی کی نعت ان کے پاکیزہ اور منزہ جذبات کی بھرپور ترجمانی کر رہی ہے۔

سعیدی صاحب کو صوبائی سیرت ایوارڈ کی مبارک باد!! اللہ عزوجل انہیں مزید عزت اور رفعت عطا فرمائے۔ مجتبیٰ شہزاد دیپ اور حنا کوثر کی نعت بھی ایمان افروز ہے۔ اندرونی صفحات پر مضامین کی رنگا رنگی ارژنگ کو حاصل مطالعہ بھی بنا رہی ہے اور استفادے کی صورتیں بھی بہم کر رہی ہے۔ شاعری کے عنوان تلے غزلیں اور نظمیں آپ کے انتخاب کو درست ثابت کرتی ہیں (شاعری پسند خاطر ہے)

پاکستان کے سوئٹزرلینڈ کی سیر ہم نے ۱۹۹۴ء میں کی تھی۔ محترمہ لبنیٰ صفدر نے آج لگ بھگ اٹھائیس برس بعد اس حسین سفر کی یاد تازہ کر دی۔

تصور اقبال

ضلع اٹک

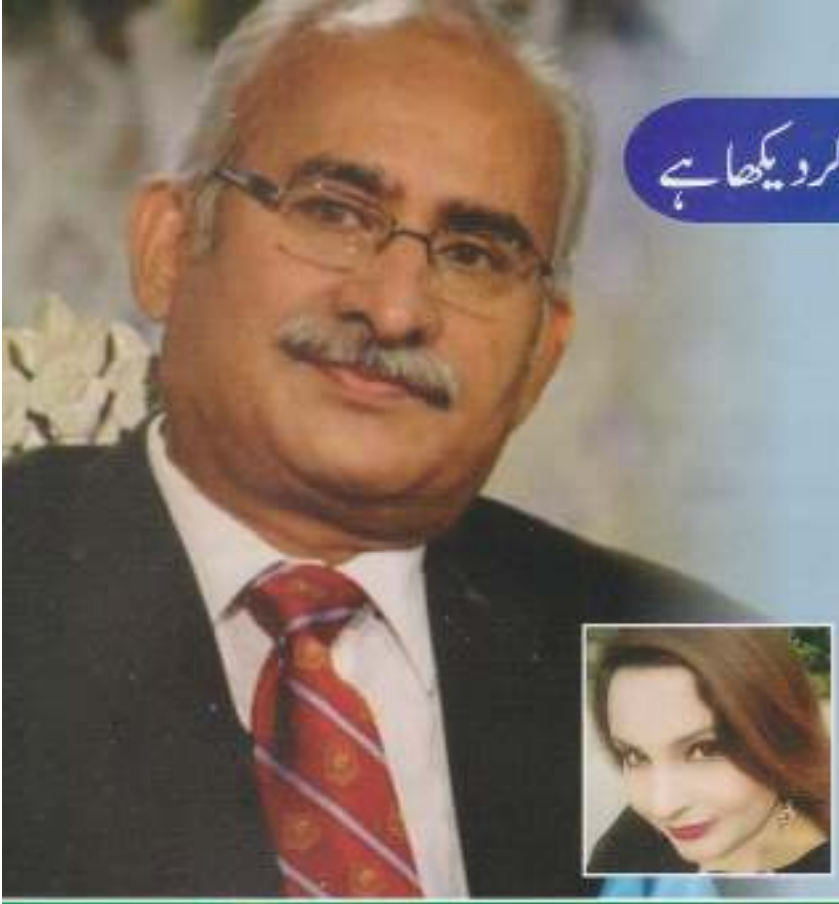

زندگی کو میں نے ہمیشہ موت کے مقابل رکھ کر دیکھا ہے

معروف افسانہ نگار، ناول نگار اور نقاد

محمد حمید شاہد

سے **لبنیٰ صفدر** کی گفتگو

ادب کا بنیادی وظیفہ بھی تو یہی ہے کہ وہ زندگی کے تجربات کو کوئی معنویت دے پائے

1۔ لوگ آپ کو نقاد، ناول نگار اور افسانہ نگار کے طور پر جانتے ہیں ان تمام ادبی جہتوں کے ساتھ زندگی کی جہتوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

محمد حمید شاہد: زندگی کو میں نے ہمیشہ موت کے مقابل رکھ کر دیکھا ہے۔ اس کی اگر کوئی معنویت ہے یا قائم ہو سکتی ہے تو اسے الگ سے دیکھنے میں نہیں موت جیسی تلخ اور یقینی حقیقت کے ساتھ دیکھنے ہی سے ممکن ہے۔ میں دیسا اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ میں نے زندگی کو اور موت دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے؛ کہہ لیجیے چھو کر، اس کے ذائقے کو چکھ کر، اس سے بغل گیر ہو کر اور موت کا معاملہ تو یہ ہے کہ یہ تو میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی ہے۔ بائی پاس سرجری کے مراحل سے پہلے ایک دو بار، اور اس دوران بھی کچھ یوں ہوا کہ میں تھا اور نہیں تھا۔ پھر جب ہوش آیا تو فراق کا کہا یاد آیا:

کیا جانے موت پہلے کیا تھی
اب میری حیات ہو گئی ہے

میں نے اپنے والد صاحب کے بدن سے ان کی روح کو یوں نکلتے محسوس کیا تھا جیسے میرے اپنے بدن سے روح نکل رہی ہو۔ پھر چھوٹے بھائی کی لاش کے ٹکڑے دیکھے تھے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں اپنے دوستوں کو گولیوں سے چھلنی ہوتے اور انہیں لاشیں ہوتے دیکھا اور بہن جو ٹھیک ٹھاک میرے ہاں آئی تھی، ہسپتال داخل ہوئی تو ان کے اپنے گھر میت گئی تھی۔ ہسپتال میں اس خوب صورت اور جواں سال لڑکی کا مرنا تو میں بھول ہی نہیں پاؤں گا؛ جی، زندگی بھر بھول نہیں پاؤں گا جو میرے ساتھ اس ہسپتال میں داخل ہوئی تھی جہاں میں اپنی گردے کی پتھری نکلوانے گیا تھا۔ نہیں اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم بے شک ایک روز ہسپتال پہنچے تھے، مگر وہ میرے ساتھ نہیں، اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ ایک خوب صورت جواں سال لڑکی جس نے اپنا گردہ اپنے باپ کو دینے کا فیصلہ کیا تھا کہ اس کا بوڑھا باپ مر رہا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ باپ بیٹی کا گردہ پا کر ٹھیک ہو گیا اور بیٹی مر گئی تھی۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

روزنامہ پاکستان کے زیرِ اہتمام

عامر بن علی کے اعزاز میں ظہرانہ

میزبان: **مجیب الرحمن شامی**

پاکستان میں صفِ اوّل کے کالم نگاروں اور کارکن صحافیوں کی شرکت

مصطفیٰ کمال پاشا، نوید الٰہی، نصیر الحق ہاشمی اور عتیق بٹ محوِ گفتگو ہیں

پیر ضیاء الحق نقشبندی، ناصر بشیر، ایثار رانا اور عامر بن علی

چوہدری خادم حسین کے علاوہ عثمان شامی کی خصوصی شرکت

محمد ارشد، عتیق بٹ، نصیر الحق ہاشمی

مجیب الرحمن شامی محوِ گفتگو اور عامر بن علی کا انہماک

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com